شام کا پہلا تارا

زہرا نگاہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

محمد اطہر اقبال

شام کا پہلا تارا

زہرا نگاہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

Sham Ka Pahla Tara
by
Zohra Nigah
Rs.85/-

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295
Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔110006 ☎ 011-23260668
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔400003 ☎ 022-23774857
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔202002 ☎ 0571-2706142
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

سنہ اشاعت: 2012 تعداد: 1100 قیمت: -/85روپے
ISBN :978-81-7587-814-3 سلسلۂ مطبوعات:1640

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025
فون نمبر:49539000 فیکس: 49539099
ای میل:urducouncil@gmail.com ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد دہلی۔110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70 GSM TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

چند معروضات

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جس نے معتبر ادیبوں کی سینکڑوں کتابیں شائع کی ہیں اور اپنے ماضی کی شان دار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ مکتبہ کے اشاعتی کاموں کا سلسلہ ۱۹۲۲ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی شروع ہوگیا تھا جو زمانے کے سرد وگرم سے گزرتا ہوا اپنی منزل کی طرف گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں۔ نامساعد حالات نے سمت ورفتار میں خلل ڈالنے کی کوشش بھی کی مگر نہ اس کے پائے استقلال میں لغزش ہوئی اور نہ عزم سفر ماند پڑا، چنانچہ اشاعتوں کا تسلسل کلّی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

مکتبہ نے خلاق ذہنوں کی اہم تصنیفات کے علاوہ طلبا کی نصابی ضرورت کے مطابق درسی کتب بھی شائع کیں اور بچوں کے لیے کم قیمت میں دستیاب ہونے والی دل چسپ اور مفید کتابیں بھی تیار کیں۔ ''معیاری سیریز'' کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ بنایا اور اسے عملی جامہ پہنایا اور یہی عمل اس کا نصب العین قرار پایا۔ مکتبہ کا یہ منصوبہ بہت کامیاب رہا اور مقبول خاص وعام ہوا۔ آج بھی اہل علم و دانش اور طلبا مکتبہ کی مطبوعات سے تعلق خاطر رکھتے ہیں۔ درس گاہوں اور جامعات میں مکتبہ کی مطبوعات کو بہ نظرِ استحسان دیکھا اور یاد کیا جاتا ہے۔

ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہوگیا تھا جس کے سبب فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کم یاب بلکہ نایاب ہوتی جارہی تھیں ان میں سے دو سو ٹائٹل قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے شائع ہو چکے ہیں اور ان سے زیادہ قطار میں ہیں (اسی دوران بچوں سے تعلق رکھنے والی تقریباً سو کتابیں مکتبہ نے بلاشرکتِ غیرے شائع کی ہیں)۔ زیرِ نظر کتاب مکتبہ جامعہ اور قومی کونسل کے مشترکہ اشاعتی سلسلے کی ہی ایک کڑی ہے۔

مکتبہ کے اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور اس کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیرمین محترم جناب نجیب جنگ صاحب (آئی اے ایس) وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے جس خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے وہ یقیناً لائق ستائش اور ناقابلِ فراموش ہے۔ مکتبہ جامعہ ان کا ممنون احسان رہے گا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اربابِ حل وعقد کا شکریہ بھی ہم پر لازم ہے، جن کے پُرخلوص تعاون کے بغیر یہ اشتراک ممکن نہ تھا۔ اوّلین مطبوعات میں کونسل کے سابق ڈائرکٹر کے تعاون کا کھلے دل سے اعتراف کیا جاچکا ہے۔ مکتبہ کی باقی کتابیں کونسل کے موجودہ فعال ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب کی خصوصی توجہ اور سرگرم عملی تعاون سے شائع ہورہی ہیں، جس کے لیے ہم ان کے اور کونسل کے وائس چیرمین پروفیسر وسیم بریلوی صاحب کے ممنون ہیں اور تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ امید کرتے ہیں کہ مکتبہ کو ہمیشہ ان مخلصین کی سرپرستی حاصل رہے گی۔

خالد محمود
منیجنگ ڈائرکٹر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

فہرست

٭ ٭ ٭

برسوں پہلے جب ہم نے پہلی بار زہرا کو سنا تب بھی مشاعرے کے نقار خانے میں ان کا طوطی بول رہا تھا لیکن اُن کے مداح انھیں داد کچھ اِس طرح کے الفاظ میں دیا کرتے تھے کہ یہ ننھی سی لڑکی ایسا عمدہ کلام کیسے کہہ سکتی ہے ضرور کوئی بزرگ لکھ کر دیتے ہوں گے اگر ان خیالی بزرگ کا کوئی وجود ہوتا اور وہ اب تک بقید حیات ہوتے، تو نجانے یہ سن کر خوش ہوتے یا آزردہ کہ یہی صاحبزادی ان سے کس درجہ بہتر شعر کہنے لگی ھیں ویسے زہرا کا ابتدائی کلام دیکھیے تو ان حضرات کا یہ گمان کچھ ایسا بیجا بھی نہیں تھا مثلاً

یہ کیا ستم ہے کوئی رنگ و بُو نہ پہچانے
بہار میں بھی رہے بند تیرے میخانے

کہاں کے عشق و محبت کدھر کے ہجر و وصال
ابھی تو لوگ ترستے ہیں زندگی کے لیے

ترا خیال فروزاں ہے دیکھیے کیا ہو
خموشِ گردشِ دوراں ہے دیکھیے کیا ہو

ہم جو پہنچے تو رہگذر ہی نہ تھی!
تم جو آئے تو منزلیں لائے

یہ ابتدائی کلام غزلوں کی صورت میں ہے جس میں غزل کی تمام خوبیاں سہی مگر ایک نوعمر حساس لڑکی کی اپنی شخصیت کا سراغ مشکل سے ملتا ہے۔

مشاعرہ لوٹنے کے بہت سے مجرب اور آزمودہ نسخے پہلے سے موجود ہیں جو زہرا نے چھوٹی سی عمر میں سیکھ لیے تھے اور اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو اسے لحن کا ایسا گداز عطا ہوا ہے جو اپنی جگہ زہرا کو مشاعرہ اسٹار بنانے کے لیے کافی تھا لیکن زھرا اس مشاعرانہ دور سے بہت جلد گزر گئیں اور جس سرعت سے یہ نسخے یاد کیے تھے اسی عجلت سے انھیں بھول گئیں اور پھر اگلے دور میں قدم رکھتے ہوئے جسے شاید رومانوی واقفیت کا دور کہہ سکتے ہیں اس کے مرحلہ ہائے ہنر بھی اتنی ہی جلدی طے کر لیے ہے

دل بجھنے لگا آتشِ رخسار کے ہوتے
تنہا نظر آتے ہیں غمِ یار کے ہوتے

ہمیں تو عادتِ زخمِ سفر ہے کیا کہیے
یہاں پہ راہِ وفا مختصر ہے کیا کہیے!

حکایتِ غمِ دنیا طویل تھی کہہ دی
حکایتِ غمِ دِل مختصر ہے کیا کہیے

رکے جا ہجومِ گُل کہ ابھی حوصلہ نہیں
دِل سے خیالِ تنگیٔ داماں گیا نہیں

رومانوی واقعیت کا یہ دَورِ زہرا کی نظم کا آغاز بھی ہے

آج پھر حلقہ بگوشوں میں اُٹھا ہے کچھ شور
کوئی ہم جیسوں پہ مائل بہ کرم ہے شاید

ہم ہیں ٹھکرائے ہوئے اپنی تمناؤں کے
اک نظر پائیں تو افسانہ بنا لیتے ہیں

کوئی کرتا ہے اگر پیار بھری بات تو ہم
شہر کے شہرِ ستاروں سے سجا دیتے ہیں

آنگن، متاعِ الفاظ، دلاسا بھی اسی دَور میں شامل ہیں۔ اس دَور کی شاعری میں آپ بیتی کے خونِ جگر کی نمود اور جگ بیتی کی پرچھائیوں کا وجود روایت اور ایجاد دونوں کے تلازمے کچھ اِس صناعی سے یکجا ہوئے ہیں کہ اگر زہرا اسی پر اکتفا کر لیتیں جب بھی جریدۂ سخن پر ان کا نقش یقیناً دوام حاصل کر لیتا لیکن اب تو انھوں نے ستاروں بھرے شہر کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے اور اس رنگ کو تج کر ایک بالکل نیا اسلوب اختیار کیا اور اس کی طاقت سے اپنے موضوعِ سخن

میں بھی بہت کچھ ترمیم کرلی ہے اس کلام میں روزمرہ کی زندگی کے جذباتی معاملات بھی ہیں جنھیں زہرا صنفِ نازک کی شاعری کہتی ہیں، جیسے ملائم گرم سمجھوتے کی چادر، قصیدۂ بہار، نیا گھر۔ علیؔ اور لقمان کے نام، سیاسی واقعات کے تأثرات بھی، وہ وعدہ بھی جو کہ انسانوں کی تقدیروں میں لکھا ہے اور محض تغزّل بھی۔ ان منظومات میں نہ جدیدیت کے غیر شاعرانہ جذبات کا کوئی پرتو ہے اور نہ رومانویت کی شاعرانہ آرایش پسندی کا کوئی دخل ہے روایتی نقش و نگار اور آرایشی رنگ و روغن کا سہارا لیے بغیر دل لگتا ہوا شعر کہنا بہت دل گردے کا کام ہے تشبیہ و استعارے سے عاری ایک آدھ بلیغ مصرع جس سے پوری نظم کا سراپا جھلملانے لگے اس کی سب سے اچھی مثال زہرا کی نظم "شام کا پہلا تارا" ہے (مجھے خوشی ہے کہ اس نے اپنی کتاب کا نام بھی یہی رکھا ہے) جو دو انسانوں کی مدارات کے لیے وقت سے پہلے نکل بھی آتا ہے اور پھر انہی دونوں کے دکھ میں شرکت کے لیے شب بھر جاگتا بھی ہے۔

جس نے ہمیں ہنس کر دیکھا تھا
وہ پہلا دوست ہمارا تھا
وہ شام کا پہلا تارا تھا
جو شاید ہم دونوں کے لیے
کچھ وقت سے پہلے نکلا تھا

٭

جس نے ہمیں دکھ سے دیکھا تھا
وہ پہلا دوست ہمارا تھا
... شام کا پہلا تارا تھا

جو شاید ہم دونوں کے لیے
اس رات سحر تک جاگا تھا

یا پھر گل چاندنی کا وہ پیڑ جس کا پھیلاؤ گھر کے آنگن کے علاوہ صحن جسم وجاں تک ہے۔

اس صحن جسم و جاں میں بھی
گل چاندنی کا پیڑ ہے
سب پھول میرے ساتھ ہیں
پتّے مرے ہمراز ہیں
اس پیڑ کا سایہ مجھے
اب بھی بہت محبوب ہے
اس کے تنے میں آج تک
آسیب وہ محصُور ہے

یا پھر بظاہر ایک بالکل ذاتی بات جس میں کسی پورے طبقے یا معاشرے کی واردات سمٹ آئے جیسے۔

میں تو اپنے آپ کو اس دن بہت اچھی لگی
وہ جو تھک کر دیر سے آیا اسے کیسا لگا

ایک خیالی تمثیل لیکن جو کسی اہم قومی یا سیاسی المیے کی تفسیر بھی ہے۔

مرے بچّے
کہانی میں بھٹکی ہاری جو لڑکی تھی
وہ شہزادی نہیں میں تھی
وہ جادو کا محل جو ایک پل میں جل کے صحرا ہو گیا تھا

وہ مرا گھر تھا

یا ایسی غزل جس کے بظاہر بے رنگ الفاظ محض خلوص جذبہ سے لَو دینے لگیں ۔

بسوا ہوئے تم کہیں نہیں ہو
آج ایسا لگتا یہیں کہیں ہو

یہ کلام پنجابی اصطلاح میں بالکل "خالص" شاعری ہے جو غالباً شاعری کا منتہی مقام ہے — زہرا کی شاعری آج کل اسی مقام پر ہے

فیض احمد فیض

بیروت - جنوری ۱۹۸۰ء

عمریست کہ قانونِ طرب رفتہ زیادم
آموختہ را باز سبق، می کنم امشب

(غالب)

جو سُن سکو تو یہ سب داستاں تمھاری ہے

انتساب

میری آنکھوں پہ تھا عذاب لہو
میری آنکھوں کو تونے خواب دیے

میں اندھیروں کے پیرہن میں تھی
میرے ہاتھوں میں ماہتاب دیے

میں چراغوں کی لَو سے ڈرتی تھی
میرے قدموں کو آفتاب دیے

مجھ کو اپنے پہ اختیار نہ تھا
مجھ کو احکامِ انتخاب دیے

کتنے اُلجھے سوال تھی مری ذات
سب کو کیسے سجل جواب دیے

سُن کے میرا فسانۂ غمِ دل
کتنے عنوان کتنے باب دیے

میرے آنچل کے سارے خار چُنے
اور مری گود میں گلاب دیے

میرے ایک ایک دُکھ کو یاد رکھا
اور سُکھ سارے بے حساب دیے

شام کا پہلا تارا

جب جھونکا تیز ہواؤں کا
کچھ سوچ کے دھیمے گزرا تھا
جب تپتے سورج کا چہرہ
اُودی چادر میں لپٹا تھا
جب سُوکھی مٹّی کا سینہ
سانسوں کی نمی سے جاگا تھا
ہم لوگ اس شام اکٹھّے تھے
جس نے ہمیں ہنس کر دیکھا تھا
وہ پہلا دوست ہمارا تھا
وہ شام کا پہلا تارا تھا
جو شاید ہم دونوں کے لیے
کچھ وقت سے پہلے نکلا تھا

جب جھل مِل کرتا وہ کمرہ
سگرٹ کے دھوئیں سے دُھندلا تھا
جب نشۂ مے کی تلخی سے !
ہر شخص کا لہجہ میٹھا تھا
ہر فکر کی اپنی منزل تھی
ہر سوچ کا اپنا رستہ تھا
ہم لوگ اُس رات اکٹھے تھے
اُس رات بھی کیا ہنگامہ تھا
میں محوِ مداراتِ عالم
اور تم کو ذوقِ تماشہ تھا
موضوعِ سخن جس پہ ہم نے
رائے دی تھی اور سوچا تھا
دُنیا کی بدلتی حالت تھی
کچھ آب و ہوا کا قصہ تھا
جب سب لوگوں کی آنکھوں میں
کمرے کا دُھواں بھر آیا تھا

ایک تیرا غم جس کو راہ معتبر جانیں
اِس سفر میں ہم کس کو اپنا ہم سفر جانیں

جس سے کچھ نہ کہہ پائیں جانِ گفتگو ٹھہرے
جس سے کم ملیں اس کو سب سے بیشتر جانیں

اپنا عکس بھی اکثر ساتھ چھوڑ جاتا ہے
یہ مآلِ خود بینی، کاش شیشہ گر جانیں

تار تار کر ڈالیں، صبر و ضبط کا دامن
زخم زخم دکھلا دیں، ظرف چارہ گر جانیں

رُک جا ہجومِ گُل کہ ابھی حوصلہ نہیں
دِل سے خیالِ تنگیٔ داماں گیا نہیں

جو کچھ ہیں سنگ و خشت ہیں یا گردِ رہگزر
تم تک جو آئے ان کا کوئی نقش پا نہیں

ہر آستاں پہ لکھا ہے اب نامِ شہر یار
وابستگانِ دل کے لیے کوئی جا نہیں

صد حیف اس کے ہاتھ ہے ہر زخم کا رفو
دامن میں جس کے ایک بھی تارِ وفا نہیں

ایک تیرا غم جس کو راہِ معتبر جانیں
اِس سفر میں ہم کس کو اپنا ہم سفر جانیں

جس سے کچھ نہ کہہ پائیں جانِ گفتگو ٹھہرے
جس سے کم ملیں اس کو سب سے بیشتر جانیں

اپنا عکس بھی اکثر ساتھ چھوڑ جاتا ہے
یہ مآلِ خود بینی. کاش شیشہ گر جانیں

تار تار کر ڈالیں، صبر و ضبط کا دامن
زخم زخم دکھلا دیں، ظرف چارہ گر جانیں

رُک جا ہجومِ گُل کہ ابھی حوصلہ نہیں
دِل سے خیالِ تنگیٔ داماں گیا نہیں

جو کچھ ہیں سنگ و خشت ہیں یا گردِ رہگزر
تم تک جو آئے ان کا کوئی نقشِ پا نہیں

ہر آستاں پہ لکھّا ہے اب نامِ شہریار
وابستگانِ دل کے لیے کوئی جا نہیں

صد حیف اس کے ہاتھ ہے ہر زخم کا رفو
دامن میں جس کے ایک بھی تارِ وفا نہیں

وہاں تم تھے
خوشی کی زندگانی کی علامت
تمناؤں کا اک خوابِ مسلسل
رفاقت کی صداقت کی ضمانت
جہاں پر صرف خوش انجام تھا، ہر ایک افسانہ
مرے بچے! وہاں تم تھے، وہاں تم تھے۔
مری آنکھیں کسی پیمان کے زخموں سے بوجھل تھیں
تمہارا عکس ان زخموں کا مرہم تھا
ادھورے عہد کے رعشے سے میرے ہاتھ لرزاں تھے
تمہارا ساتھ اک تسکینِ پیہم تھا
مجھے اقرار تھا
میں خاک ہوں
تم حسن و زیبائش
مجھے احساس تھا
میں خوف ہوں
تم امن و آسائش

وہ جن میں گھر گئی تھی

غیر کیا سب میرے اپنے تھے

جہاں اس کا فسانہ تھا

وہیں میری حقیقت تھی

جہاں وُہ مڑ کے پتھر ہو گئی

میری محبت تھی

ہزاروں آگ کے میدان تھے

بارش لہو کی تھی

یہ سب کچھ میرا قصّہ تھا

یہ سب کچھ مجھ پہ گذری تھی

مرے بچّے کہانی میں

تھکی ہاری جو لڑکی تھی

وہ شہزادی نہیں ہیں تھی

جہاں قصّے کا آخر تھا

مرے بچے !

وہاں تم تھے
خوشی کی زندگانی کی علامت
تمناؤں کا اِک خوابِ مسلسل
رفاقت کی صداقت کی ضمانت
جہاں پر صرف خوش انجام تھا، ہر ایک افسانہ
مرے بچّے ! وہاں تم تھے ، وہاں تم تھے .
مری آنکھیں کسی پیمان کے زخموں سے بوجھل تھیں
تمہارا عکس اِن زخموں کا مرہم تھا
ادھورے عہد کے رعشے سے میرے ہاتھ لرزاں تھے
تمہارا ساتھ اِک تسکینِ پیہم تھا
مجھے اقرار تھا
میں خاک ہوں
تم حُسن و زیبائش
مجھے احساس تھا
میں خوف ہوں
تم امن و آسائش

وہ جن میں گھر گئی تھی
غیر کیا سب میرے اپنے تھے
جہاں اس کا فسانہ تھا
وہیں میری حقیقت تھی
جہاں وُہ مڑ کے پتھر ہو گئی
میری محبت تھی
ہزاروں آگ کے میدان تھے
بارش لہو کی تھی
یہ سب کچھ میرا قصہ تھا
یہ سب کچھ مجھ پہ گذری تھی
مرے بچے کہانی میں
تھکی ہاری جو لڑکی تھی
وہ شہزادی نہیں میں تھی

جہاں قصے کا آخر تھا
مرے بچے!

بُلاوا

چلو اُس کوہ پر اب ہم بھی چڑھ جائیں
جہاں پر جا کے پھر کوئی کبھی واپس نہیں آتا
سنا ہے اک ندائے اجنبی باہوں کو پھیلائے
جو آئے اس کا استقبال کرتی ہے
اُسے تاریکیوں میں لے کے آخر ڈوب جاتی ہے
یہی وہ راستہ ہے جس جگہ سایہ نہیں جاتا
جہاں پر جا کے پھر کوئی کبھی واپس نہیں آتا

جو سچ پوچھو تو ہم تم زندگی بھر ہارتے آئے
ہمیشہ بے یقینی کے خطر سے کانپتے آئے
ہمیشہ خوف کے پیراہنوں سے اپنے پیکر ڈھانپتے آئے
ہمیشہ دوسروں کے سایے میں اِک دوسرے کو چاہتے آئے
بُرا کیا ہے اگر اس کوہ کے دامن میں چھپ جائیں

چھلک رہی ہے مئے ناب تشنگی کے لیے
سنور رہی ہے تری بزمِ برہمی کے لیے

نہیں نہیں ہمیں اب تیری جستجو بھی نہیں
تجھے بھی بھول گئے ہم تری خوشی کے لیے

جو تیرگی میں ہویدا ہو قلبِ انساں سے
ضیا نواز وہ شعلہ ہے تیرگی کے لیے

کہاں کے عشق و محبت، کدھر کے ہجر و وصال
ابھی تو لوگ ترستے ہیں زندگی کے لیے

جہانِ نَو کا تصوّر، حیاتِ نَو کا خیال
بڑے فریب دیے تم نے بندگی کے لیے

مئے حیات میں شامل ہے تلخیٔ دوراں
جبھی تو پی کے ترستے ہیں بیخودی کے لیے

بُلاوا

چلو اُس کوہ پر اب ہم بھی چڑھ جائیں
جہاں پر جا کے پھر کوئی کبھی واپس نہیں آتا
سنا ہے اک ندائے اجنبی بانہوں کو پھیلائے
جو آئے اس کا استقبال کرتی ہے
اُسے تاریکیوں میں لے کے آخر ڈوب جاتی ہے
یہی وہ راستہ ہے جس جگہ سایہ نہیں جاتا
جہاں پر جا کے پھر کوئی کبھی واپس نہیں آتا

جو سچ پوچھو تو ہم تم زندگی بھر ہارتے آئے
ہمیشہ بے یقینی کے خطر سے کانپتے آئے
ہمیشہ خوف کے پیراہنوں سے اپنے پیکر ڈھانپتے آئے
ہمیشہ دوسروں کے سایے میں اِک دوسرے کو چاہتے آئے
بُرا کیا ہے اگر اس کوہ کے دامن میں چھپ جائیں

چھلک رہی ہے مئے ناب تشنگی کے لیے
سنور رہی ہے تری بزم برہمی کے لیے

نہیں نہیں ہمیں اب تیری جستجو بھی نہیں
تجھے بھی بھول گئے ہم تری خوشی کے لیے

جو تیرگی میں ہویدا ہو قلب انساں سے
ضیا نواز وہ شعلہ ہے تیرگی کے لیے

کہاں کے عشق و محبت، کدھر کے ہجر و وصال
ابھی تو لوگ ترستے ہیں زندگی کے لیے

جہانِ نَو کا تصوّر، حیاتِ نَو کا خیال
بڑے فریب دیے تم نے بندگی کے لیے

مئے حیات میں شامل ہے تلخیٔ دوراں
جبھی تو پی کے ترستے ہیں بیخودی کے لیے

آنگن

در، دیوار، دریچے، آنگن

دہلیزیں دالان اور کمرے

سارے رُوپ یہ کتنے نازک

سوچو تو مٹی کے کھلونے

میرے لیے یہ کنجِ عبادت

میرے لیے یہ کوہِ صداقت

میرے لیے یہ منزلِ وعدہ

خُلدِ تحفظ، قصرِ رفاقت

جس کے راج سنگھاسن بیٹھی

میں رانی ہوں، میں بیچاری

باہر چاہے طوفاں آئیں

لیکن یاں سب چین سے سوئیں

جب جاگیں، تب سورج نکلے

اس خموشی کے اندھیروں سے نکل آئیں چلو
کسی سُلگے ہوئے لہجے سے چراغاں کرلیں
چُن لیں پھولوں کی طرح ہم بھی متاعِ الفاظ
اپنے اُجڑے ہوئے دامن کو گلستاں کرلیں

دولتِ درد بڑی چیز ہے اقرار کرو
نعمتِ غم بڑی نعمت ہے یہ اظہار کرو
لفظ پیمان بھی، اقرار بھی، اظہار بھی ہیں
طاقتِ صبر اگر ہو تو یہ غمخوار بھی ہیں
ہاتھ خالی ہوں تو یہ جنسِ گرانبار بھی ہیں
پاس کوئی بھی نہ ہو پھر تو یہ دلدار بھی ہیں

یہ جو تم مجھ سے گریزاں ہو مری بات سنو

آنگن

در، دیوار، دریچے، آنگن

دہلیزیں دالان اور کمرے

سارے رُوپ یہ کتنے نازک

سوچو تو مٹی کے کھلونے

میرے لیے یہ کنجِ عبادت

میرے لیے یہ کوہِ صداقت

میرے لیے یہ منزلِ وعدہ

خُلدِ تحفظ، قصرِ رفاقت

جس کے راج سنگھاسن بیٹھی

میں رانی ہوں، میں بیچاری

باہر چاہے طوفاں آئیں

لیکن یاں سب چین سے سوئیں

جب جاگیں، تب سورج نکلے

اس خموشی کے اندھیروں سے نکل آئیں چلو
کسی سُلگے ہوئے لہجے سے چراغاں کر لیں
چُن لیں پھولوں کی طرح ہم بھی متاعِ الفاظ
اپنے اُجڑے ہوئے دامن کو گلستاں کر لیں

دولتِ درد بڑی چیز ہے اقرار کرو
نعمتِ غم بڑی نعمت ہے یہ اظہار کرو
لفظ پیمان بھی، اقرار بھی، اظہار بھی ہیں
طاقتِ صبر اگر ہو تو یہ غم خوار بھی ہیں
ہاتھ خالی ہوں تو یہ جنسِ گرانبار بھی ہیں
پاس کوئی بھی نہ ہو کچھ تو یہ دلدار بھی ہیں

یہ جو تم مجھ سے گریزاں ہو مری بات سنو

محل دو محلے ہٹتے جائیں !
چھوٹا آنگن ، نیچے کمرے !
دُور دُور سے ہاتھ ہلائیں !
بیتے لمحے جُگنو ایسے
اڑتے اور چمکتے آئیں ،
مٹھی باندھ کے اُن کو دیکھوں
چمپا پھول مہکتے جائیں
جگ مگ جگ مگ سونے جیسا
گھر سب کی نظروں میں آیا
بھیگا آنچل ، پھیلا کاجل
کِس نے دیکھا کِس نے چھپایا !

دُور دُور جا جا کر ہم تو لوٹ لوٹ آئے
تم گئے تو منزل نے خود ہی ہاتھ پھیلائے

وقت کی فضاؤں پر کون ہو سکا حاکم
کتنے چاند چمکے تھے، کتنے چاند گہنائے

جب صبا سناتی تھی گیت زندگانی کا
اب صبا کے آتے ہی کتنے پھول مُرجھائے

وقت کو سنبھلنے دے رنگ کو بدلنے دے
روشنی اُبھاریں گے ظلمتوں کے یہ سایے

عشرتِ محبت کے زخم رہ گئے باقی،
تلخیٔ زمانہ کو کوئی کیسے سمجھائے

منزلو! کہاں ہو تم آؤ اب قدم چومو
آج ہم زمانے کو اپنے ساتھ لے آئے

اِس رہ گذر میں اپنا قدم بھی جُدا مِلا
اِتنی صعوبتوں کا ہمیں یہ صِلہ ملا

اِک وسعتِ خیال کہ لفظوں میں گھر گئی
لہجہ کبھی جو ہم کو کرم آشنا ملا

تاروں کو گردشیں ملیں، ذرّوں کو تابشیں
اے رہ نوردِ راہِ جنُوں تجھ کو کیا ملا

ہم سے بڑھی مسافتِ دشتِ وفا کہ ہم
خود ہی بھٹک گئے جو کبھی راستہ ملا

ہر خار عنایت تھا ہر اک سنگ صلہ تھا
اُس راہ میں ہر زخم ہمیں راہنما تھا

اے شیشہ گرو! کچھ تو کرو آئینہ خانہ
رنگوں سے خفا رُخ سے جُدا یوں نہ ہوا تھا

اُن آنکھوں سے کیوں صبح کا سُورج ہے گریزاں
جن آنکھوں نے راتوں میں ستاروں کو چُنا تھا

کیوں گھر کے اب آئے ہیں یہ بادل یہ گھٹائیں
ہم نے تو تجھے دیر ہوئی یاد کیا تھا

اب تک شریکِ محفلِ اغیار کون ہے
ہم بے وفا ہوئے تو خطا وار کون ہے

یاں سب کو مل گئے ہیں سہارے بقدرِ شوق
تم سوچتے رہے کہ طلب گار کون ہے

نظروں نے کس کی چاک کیے پردہ ہائے رنگ
سنولا دیا ہے جس نے رُخِ یار کون ہے

دامن ہزار چاک ، گریباں ہزار وا
یہ دیکھنا ہے کتنا گنہ گار کون ہے

آنکھوں پہ قرض آج بھی ہے تیرے خواب کا
آساں راستوں میں بھی دشوار کون ہے

اِک روشنی اُمّید کی اِک عزمِ جاوداں
ظلماتِ زندگی میں ہے رقصاں رواں دواں

کتنا ہے سخت جان مرا ذوقِ بندگی
سو بار مٹ چکا ہے ترا سنگِ آستاں

چھٹنے لگا حیات کے رُخ سے فسونِ مرگ
منہ دیکھتے ہیں وقت کے پابند نوحہ خواں

چھیڑو ہر ایک تار کو سازِ حیات کے
پوشیدہ سب انہی میں ہیں نغماتِ جاوداں

کتنی ذرا سی بات ہے خواہش سکون کی
اک داستان ہو گئی تعمیر آشیاں

گم کردہ راہ ہیں ہمیں منزل نہیں ملی
نا رو تمہاری طرح سے بکھرا ہے کارواں

اہتمامِ شبِ اُمید

آج پھر حلقہ بگوشوں میں اُٹھا ہے کچھ شور
کوئی ہم جیسوں پہ مائل بہ کرم ہے شاید

یاس کی شام ڈھلی آس کی کرنیں پھوٹیں
پھر چمکنے لگے ارمانوں کے صحرا میں سراب
ہر تصوّر نے دیئے کتنے فریب آنکھوں کو
سطحِ اُمید پہ پھوٹے کئی غنچوں کے حباب

پھر کسی یاد کے پہلو سے اٹھا ہے کوئی درد
پھر کسی دل کے دریچے میں سجی ہے دھڑکن
ہار پھر گوندھے گئے پیار بھری باتوں کے
پھر سے مہکائے گئے حسنِ نظر کے گلشن

پھر کسی ماتھے سے اُبھرا ہے خَم و پیچ کا حُسن
پھر سے جھلکی ہے نگاہوں میں کرن خوابوں کی
پھر کسی لب پہ لرزتا ہے کسی پیار کا بوجھ
پھر کسی سینے میں جاگی ہے مہک سانسوں کی

پھر سے روشن ہوئے راہوں میں بھروسوں کے چراغ
پھول کی طرح بکھیرا گیا اُمیدوں کو
مخملیں فرش بچھانے لگیں پلکیں ہر سُو
تا کہ جب آئیں کرم گار تو تکلیف نہ ہو

اہتمامِ شبِ اُمید بہم ہونے لگا
دِل سے اندازۂ غم اور بھی کم ہونے لگا

ہم ہیں ٹھکرائے ہوئے اپنی تمناؤں کے
اک نظر پائیں تو افسانہ بنا لیتے ہیں
کوئی کرتا ہے اگر پیار بھری بات تو ہم
شہر کے شہر ستاروں سے سجا دیتے ہیں

گل چاندنی

کل شام یاد آیا مجھے !
ایسے کہ جیسے خواب تھا
کونے میں آنگن کے مرے
گل چاندنی کا پیڑ تھا

میں ساری ساری دوپہر
سایے میں اُس کے کھیلتی
پھولوں کو چھُو کر بھاگتی
شاخوں سے مِل کر جھُولتی

اس کے تنے میں بیسیوں !
لوہے کی کیلیں تھی جڑی
کیلوں کو مت چھونا کبھی
تاکید تھی مجھکو یہی !

یہ راز مجھ پہ فاش تھا

اس پیڑ پر آسیب تھا !

اِک مردِ کامل نے مگر

ایسا عمل اس پر کیا

باہر وہ آسکتا نہیں !!

کیلوں میں اس کو جڑ دیا

ہاں کوئی کیلوں کو اگر

کھینچے گا اوپر کی طرف !

آسیب بھی چھٹ جائے گا

پھولوں کو بھی کھا جائے گا

پتّوں پہ بھی منڈلائے گا

پھر دیکھتے ہی دیکھتے

یہ گھر کا گھر جل جائے گا

اس صحن جسم وجاں میں بھی

گل چاندنی کا پیڑ ہے !

سب پھول میرے ساتھ ہیں
پتّے مِرے ہمراز ھَیں
اِس پیڑ کا سَایہ مجھے !
اب بھی بہت محبوب ہے
اس کے تنے میں آج تک
آسیب وہ محصور ہے
یہ سوچتی ہوں آج بھی !
کِیلوں کو گر چھیڑا کبھی
آسیب بھی چھٹ جائے گا
پتّوں سے کیا لینا اُسے
پھولوں سے کیا مطلب اُسے
بس گھر مرا جل جائے گا
کیا گھر مرا جل جائے گا؟

قصیدۂ بہار

اب آؤ ہم لوگ پھر سے سیکھیں، تمام اقرار کے طریقے
تمام دَورِ جنوں کی رسمیں، تمام اظہار کے سلیقے

تم اپنی آنکھوں سے میری آنکھوں کے جام بھر دو
اگر پیالوں کے کچھ کنارے شکستہ ہوں بھی تو حرج کیا ہے
مئے وفا کی نمی تو ہوگی

تم اپنے ہاتھوں سے میرے بالوں کی لَٹ سنوار دو
سیاہیٔ شب کی دلفریبی نہیں ملے گی تو خوف کیا ہے
کہیں کہیں چاندنی تو ہوگی

تم اپنے ناموں کی لاکھ مہروں کو میرے چہرے پہ ثبت کر دو
یہ عہد نامہ ورق ورق ہو تو سوچنا کیا!
عبارتِ زندگی تو ہوگی

تم اپنی باہنوں کے تنگ حلقے میں مجھ کو رکھ لو !
اگر نہیں جسم کا چراغاں ، تو فکر کیسی
کہ روح کی روشنی تو ہو گی

یہ حسنِ تکرارِ دائمی ہے، یہ ذوقِ تجدیدِ ارتقا ہے
کبھی صحیفوں کی آیتوں کو بھی پڑھتے پڑھتے کوئی تھکا ہے

اگر تم کہو تو!

اگر تم کہو تو
میں وہ ساری باتیں ہواؤں سے کہہ دوں
جو آنکھوں ہی آنکھوں میں ہم نے کہی ہیں
اشاروں اشاروں میں ہم نے سُنی ہیں
کہ یہ آتے جاتے ہوئے نرم جھونکے
ہر اک راستے پر مری راہ روکے
کبھی میرے بالوں سے گجرا گرا کر
کبھی میرے شانے کا پلّو ہلا کر
مجھے اس طرح چھیڑتے ہیں کہ جیسے
وہ سب جانتے ہوں

اگر تم کہو تو
میں اپنی فسُردہ دِلی کے فسانے

اُمڈتے ہوئے بادلوں کو سُنا دوں
فسانے جو خاموشیوں نے سُنے ہیں
جنھیں سُن کے دیوار و دَر رو دیے ہیں
کہ یہ رس کے رسیا
یہ گھنگھور بادل
چھپائے ہوئے اپنی امرت کی چھاگل
گرج کر ڈرا کر
مرے گھر پہ چھاکر
مجھے اس طرح دیکھتے ہیں کہ جیسے
وہ سب جانتے ہوں

اگر تم کہو تو
میں اپنی کہانی سمندر سے کہدوں
سمندر ہمارے جنوں کی علامت
سمندر ہمارے سُکوں کا نشاں بھی
سمندر کہ طاقت بھی، وسعت بھی، ماں بھی

جبھی تو سمندر کے ویران گوشے
چٹانوں کی پلکوں کے نمکین قطرے
وہ خُود رَو ببولوں کے آزردہ سایے
چٹختی زمینوں کے مایوس چہرے
مجھے اس طرح چاہتے ہیں کہ جیسے
وُہ سب جانتے ہوں

دِل بجھنے لگا آتشِ رخسار کے ہوتے
تنہا نظر آتے ہیں غمِ یار کے ہوتے

کیوں بدلے ہوتے ہیں نگہِ ناز کے انداز
اپنوں پہ بھی اُٹھ جاتی ہے اغیار کے ہوتے

ویراں ہے نظر میری ترے رُخ کے مقابل
آوارہ ہیں غم کوچۂ دلدار کے ہوتے

اِک یہ بھی ادا تھی دلِ آشفتہ سراں کی
بیٹھے نہ کہیں سایۂ دیوار کے ہوتے

جینا ہے تو جی لیں گے بہر طور دِوانے
کِس بات کا غم ہے رسن و دار کے ہوتے

تپشِ غم نہ رہی سایۂ مژگاں کی طرح
ہوسِ گل بھی گئی تنگیٔ داماں کی طرح

میں تجھے ڈھونڈوں، مگر عمرِ گریزاں کی طرح
تو مجھے دیکھے مگر خوابِ پریشاں کی طرح

ہم تہی دست بس اک دولتِ دل رکھتے ہیں
یہ نہ بک جائے کہیں مالِ غریباں کی طرح

حاصلِ دشت نوردی یہی ٹھہرا آخر
ساتھ تھا کوئی بیابان میں بہاراں کی طرح

جو دِل نے کہی لب پہ کہاں آئی ہے دیکھو
اب محفلِ یاراں میں بھی تنہائی ہے دیکھو

پھولوں سے ہوا بھی کبھی گھبرائی ہے دیکھو
غنچوں سے بھی شبنم کبھی کترائی ہے دیکھو

اب ذوقِ طلب وجہ جنوں ٹھیر گیا ہے
اور عرضِ وفا باعثِ رُسوائی ہے دیکھو

غم اپنے ہی اشکوں کا خریدار ہُوا ہے
دِل اپنی ہی حالت کا تماشائی ہے دیکھو

کیوں اے غمِ فراق یہ کیا بات ہوگئی
ہم انتظارِ صبح میں تھے رات ہوگئی

بہکے ہوئے بھٹکتے ہوئے کارواں کی خیر
رہبر سے راہزن کی ملاقات ہوگئی

دیوانگی کی خیر نہ مانگیں تو کیا کریں
دیوانگی ہی رازِ عنایات ہوگئی

سینوں میں سوز و سازِ محبت نہیں رہا
دُنیا رہینِ گردشِ حالات ہوگئی

لو ڈوبتوں نے دیکھ لیا ناخدا کو آج
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات ہوگئی

نیا گھر

کہیں دُور بستی کی آغوش میں
وہ ہمکتا ہوا اک نیا گھر

اپنے اطراف سے بے خبر
ننھے بچّے کے مانند ہنستا ہوا
اِک نئے پن کی خوشبو میں بستا ہوا
ہمیشہ مجھے اور تم کو بلاتا رہے گا
اپنی مٹھّی کے گھنگھرو بجاتا رہے گا

وہ نیا گھر جو میرا تمھارا نہیں تھا
کسی طور سے بھی ہمارا نہیں تھا
کوچہ کوچہ بھٹکتے ہوئے جس کے دَر پر
تھکے ہارے ہم تم شکستہ دل و خاک بر سر
تن پہ بارِ ندامت اٹھائے ہوئے رک گئے تھے
اُس کے دیوار و در فرش، آنگن

ہمیں دیکھ کر کس طرح جھک گئے تھے
اس کے پھیلے ہوئے بازوؤں نے
ہمیں اس طرح سے سمویا
اور ایسے جگہ دی
کہ چہروں کی مٹّی رفاقت کی افشاں بنی
اور ندامت کی زردی نہ جانے کہاں مٹ گئی
مجھ کو ایسا لگا جیسے انمول موتی
تہہِ آب سے موج در موج لڑتا ہوا
خود کنارے تک آ گئے
اپنا خاکستری خول سورج کی تحویل میں دے کے
ساری تھکن بھول جائے
پھر شعاعِ محبت سے سارا جہاں جگمگائے
میرے دِل نے دُعا دی، خداوندِ برتر
اسی روشنی میں نہاتا رہے یہ نیا گھر
اپنی مٹّی کے گھنگھرو بجاتا رہے یہ نیا گھر
ہماری طرح دوسرے دِل زدوں کو بلاتا رہے یہ نیا گھر

سمجھوتہ

مُلائم گرم سمجھوتے کی چادر
یہ چادر میں نے برسوں میں بُنی ہے
کہیں بھی سچ کے گُل بوٹے نہیں ہیں
کِسی بھی جھوٹ کا ٹانکا نہیں ہے

اِسی سے میں بھی تن ڈھک لوں گی اپنا
اِسی سے تم بھی آسُودہ رہو گے!
نہ خوش ہو گے نہ پژمُردہ رہو گے

اسی کو تان کر بن جائے گا گھر
بچھا لیں گے تو کھل اٹھے گا آنگن
اُٹھا لیں گے تو گر جائے گی چلمن

تراشیدم ـــــ شکستم

ابھی تک مرے زخم تازہ ہیں
اور میرے ناخن بُری طرح سے دُکھ رہے ہیں
ابھی تک مرے دونوں بازو
کسی شاخِ بیجاں کی مانند ٹوٹے ہوتے ہیں

مرے سامنے میرے ہاتھوں تراشا ہوا ایک پیکر
نگاہوں میں جس کے تمسخر کی رنگت
مجھے اس حقارت سے کیوں دیکھتا ہے

مجھے ڈر ہے اس کا یہ انداز مجھ کو
غرور و تکبر کا آغاز مجھ کو
مرے شاخِ بیجاں کے مانند ٹوٹے ہوئے بازوؤں کو
تنفر کی طاقت کا وہ زور دیدے
کہ اِک ضرب سے میں اسے توڑ ڈالوں

آج غمگیں نہیں حیران ہیں ہم

آج کی رات بہت بوجھل ہے
کوئی بتلاؤ کہ یہ کیسے کٹے !

خشک ہیں آنکھوں کے چشمے سارے
تشنہ سامانی کی حد ہوتی ہے
اب کسی دھیان کا سایہ بھی نہیں
خانہ ویرانی کی حد ہوتی ہے

ہم نے پہلے تو سُنا تھا کہ یہ وقت
تارے گن لو تو گزر جاتا ہے
ہر وہ لمحہ جو ٹھہر جانے کو ہو
بات کر لو تو بکھر جاتا ہے

آج غمگیں نہیں حیران ہیں ہم
راز اس درد کا کھلتا ہی نہیں
ایسی اُجڑی ہے گزرگاہِ خیال
کیسی منزل کوئی رستہ ہی نہیں

آج کی رات گزاریں کیسے ؟
صبح تک جانیے کیا کیا ہو جائے
جِس سے احساس کی لَو لرزاں ہے
وہ تصوّر نہ پریشاں ہو جائے

مشورہ

مجھے یہ ڈر ہے کسی آفتاب کی گرمی
تری نظر کے ہزار آئینوں کو توڑ نہ دے
مجھے یہ وہم کسی ماہتاب کی ٹھنڈک
لہو سے گرمیٔ فکر و عمل نچوڑ نہ لے

تو اپنی ذات سے خود چشمۂ ادا و صدا
تجھے جہاں کی ہواؤں کے رُخ سے کیا نسبت
تو اپنے آپ ہی خود انجمن ہے خود ہی چراغ
ہجومِ حلقہ بگوشاں سے تجھ کو کیا نسبت

یہ راستہ نہیں وہ جس پہ تو ٹھہر جائے
یہاں سے جلد گزر عکسِ مہر و مہ کیطرح

یہاں پہ کوئی رُکا ہے تو خارِ رہ کی مثال
یہاں پہ کوئی رُکا ہے تو گردِ رہ کی طرح

جو آستاں ہو اُسے سنگِ در کا غم کیسا
جو خود سفر ہو اُسے رہگذر کا غم کیسا
جو خود یقیں ہو اسے وہم انتظام سے کیا
جو خود ہی مے ہو اسے میکدے کے نام سے کیا

دلاسا

دوستی کا اِک سمندر
ان گِنت ساحل وفا کے
اپنے سینے میں چھُپائے
جانے کب سے بہہ رہا تھا
دفعتاً اِک موج اُبھری
موتیوں کی شکل میں
ڈھلتے ہوئے الفاظ جملے
خودبخود دل سے اُٹھے
لب تک گئے
دِل کا ہر اک بوجھ لفظوں نے اُٹھایا
فکر کا ہر لمحہ اِک جُملے سے ٹکرایا
بِکھر کر کھو گیا
غم کا ریزہ ریزہ
کچھ باتوں کی رَو میں بہہ گیا

ماں

جو شاخ اب تک زمیں کے سینے سے سر لگائے لرز رہی تھی
صفِ گلستاں میں کس طرح سے کھڑی ہوئی کتنا ہنس رہی ہے
ہوا کے رتھ پر سوار وہ موسموں کا راجا
کچھ اس کے کانوں میں کہہ گیا ہے
وہ کہہ گیا ہے تمہارے دونوں گلاب خوش ہیں
جہاں بھی ہیں جانِ انجمن ہیں
وہ اپنی خوشبو سے آپ سرشار، اپنی رنگت میں خود مگن ہیں

وحشت میں بھی منّت کشِ صحرا نہیں ہوتے
کچھ لوگ بکھر کر بھی تماشا نہیں ہوتے

جاں دیتے ہیں، جاں دینے کا سودا نہیں کرتے
شرمندۂ اعجازِ مسیحا نہیں ہوتے

ہم خاک تھے پر جب اسے دیکھا تو بہت روئے
سنتے تھے کہ صحراؤں میں دریا نہیں ہوتے

اِک تارِ گریباں کا رہے دھیان کہ سب لوگ
محفل میں تو ہوتے ہیں شناسا نہیں ہوتے

ہمیں تو عادتِ زخمِ سفر ہے کیا کہیے
یہاں پہ راہِ وفا مختصر ہے کیا کہیے

جُدائیاں تو یہ مانا بڑی قیامت ھیں
رفاقتوں میں بھی دُکھ کس قدر ہے کیا کہیے

حکایتِ غمِ دُنیا طویل تھی کہہ دی
حکایتِ غمِ دِل مختصر ہے کیا کہیے

مجالِ دید نہیں ، حسرتِ نظّارہ سہی
یہ سلسلہ ہی بہت معتبر ہے کیا کہیے

مدھ ماتی پون لہرائے

مدھ ماتی پون لہرائے
جگ بھر سے کہنے جائے
مورے آنگن کوئی آئے
کوئی دُور دُور سے آئے

سات سنگھار سُہاگن کے آنچل سے بندھے مجھے سونپ گئی
چلتے چلتے مرے کانوں میں یہ کیسا امرت گھول گئی
بیں چھپتی پھرُوں ستاروں سے، مجھے آئے لاج بہاروں سے
میں جو بھی نہ کہنے پاؤں سکھی، مورا انگ انگ کہہ جائے
مدھ ماتی پون لہرائے ......

پیاسی جو رہوں تو پربت کے سینے سے دریا پھوٹ بہے
پل بھر آکاش کو تک لوں تو، بجلی چمکے، بادل برسے

تھک جاؤں تو سورج رتھ رو کے، سو جاؤں چندر ماں لوری دے

میں سوکھے پیڑ تلے بیٹھوں، وہ ھرا بھرا ہو جائے

مدھ ماتی پون لہرائے ....

میں نے دِل سے کہا شعبدہ گر ! کیسے جادو دکھاتا ہے مجھ کو

کیسے محفل سجاتا ہے اس کی، کیسے پاگل بناتا ہے مجھ کو

کوچہ کوچہ پرانی روش ہے، صحرا صحرا پرانی ڈگر ہے

دیکھنا ہے نیا رنگ ِ وحشت کیا طریقے سکھاتا ہے مجھ کو

ایک پرانی کہانی

کِسی شہر میں اِک کفن چور آیا
جو راتوں کو قبروں میں سُوراخ کر کے
تنِ کشتگاں سے کفن کھینچ لیتا
آخرِ کار پکڑا گیا
اور اس کو مناسب سزا ہو گئی

کچھ ہی دِن بعد اِک دوسرا چور وارد ہوا
جو کفن بھی چُراتا
قبر کو بھی کھُلا چھوڑ دیتا
دوسرا چور بھی رکنِ انصاف کے پاس لایا گیا۔
اور مہمان زنداں ہُوا۔

پھر یکایک کسی تیسرے چور کا غُل مچا

جو کفن بھی چُراتا
قبر کو بھی کھُلا چھوڑ دیتا
اور مردہ بدن کو برہنہ کسی راہ پر ڈال دیتا

شہر والے اُسے جب عدالت میں لائے
تو قاضی نے اس کی سزا کو سناتے ہُوئے
فیصلہ یُوں لکھا
"خداوند پہلے کفن چور کو اپنی رحمت میں رکھنا کہ وہ آدمی خُوب تھا"

ایک اور پرانی کہانی

چرواہے کی الھڑ بیٹی آج بہت حیران ہوئی ہے
خالی برتن ہاتھ میں تھامے واپس گھر کو لوٹ آئی ہے
کل تک اس کی گائیں دودھ کی وہ ندیاں تھیں
جن کی نہریں گانو گانو پھوٹ رہی تھیں
رات کی رات میں ایسا کیسے ہو سکتا ہے
خالی برتن خالی کیسے رہ سکتا ہے

چرواہا بولا ، بیٹی ایسا ہوتا ہے
اور ایسا پہلے بھی ہوا ہے
ہری بھری بستی کا راجا جب بدنیت ہو جاتا ہے
کھیت سے دانہ کنوؤں سے پانی دودھ تھنوں سے اُڑ جاتا ہے

برسوں ہوئے تم کہیں نہیں ہو
آج ایسا لگا یہیں کہیں ہو

محسوس ہوا کہ بات کی ہے
اور بات بھی وہ جو دلنشیں ہو

اِمکان ہوا کہ وہم تھا سب
اظہار ہوا کہ تم یقیں ہو

اندازہ ہوا کہ رہ وہی ہے
اُمید بڑھی کہ تم وہیں ہو

اب تک مرے نام سے ہے نسبت
اب تک مرے شہر کے مکیں ہو

غم بھی اس دل کا آسرا نہ ہوا
تیرا احسان تھا ادا نہ ہوا

لبِ گویا تو مل گیا تھا ہمیں
صرفِ اظہارِ مُدّعا نہ ہوا

یہ ہے انعامِ آبلہ پائی
ساتھ چلنے کا حوصلہ نہ ہوا

نارسائی مزاجِ دِل ٹھہری
ختم کوئی بھی سلسلہ نہ ہوا

زخم تو اب بھی دے رہے ہیں صدا
ذوقِ پرسش مگر سِوا نہ ہوا

اپنا ہر انداز آنکھوں کو تر و تازہ لگا
کتنے دِن کے بعد مجھ کو آئینہ اچھا لگا

سارا آرائش کا ساماں میز پر سوتا رہا
اور چہرہ جگمگاتا، جاگتا، ہنستا لگا

ملگجے کپڑوں پہ اُس دن کس غضب کی آب تھی
سارے دن کا کام اُس دن کس قدر ہلکا لگا

چال پر پھر سے نمایاں تھا دلآویزی کا زُعم
جس کو واپس آتے آتے کس قدر عرصہ لگا

میں تو اپنے آپ کو اُس دن بہت اچھی لگی،
وہ جو تھک کر دیر سے آیا اُسے کیسا لگا!

کیسی سُتھری شام ہے دیکھو

کیسی سُتھری شام ہے دیکھو

دُھلی دھلائی

مٹّی کی سوندھی خوشبو میں

بسی بسائی

پتا پتا تھمی ہوئی بارش کے موتی اپنے تن سے ڈھلکاتا ہے

اپنی رنگت، اپنے کومل پن پر کیا کیا اِتراتا ہے!

دُور دُور تک پیدل جانا

گہری گہری سانسیں لینا

اپنے آپ سے باتیں کرنا

سب کچھ کیا اچھا لگتا ہے

ہوا کے جھونکے امرت کے لبریز پیالے

سر پہ اُٹھائے

اِدھر اُدھر آتے جاتے ہیں۔

کبھی کبھی امرت کی بوندیں گر جاتی ہیں
جب آپس میں ٹکراتے ہیں
میرے بالوں کے بادل میرے شانوں پہ اُڑے جاتے ہیں
برسوں کی تپتی آنکھوں میں دھانی رنگ گھلے جاتے ہیں
دیکھتے دیکھتے کیسا نشّہ چھا جاتا ہے
پھر تو جو میں چاہوں وہی نظر آتا ہے
یہ موسم، یہ باغ، یہ رستہ
سب کچھ کیا اپنا لگتا ہے
حالانکہ تم ساتھ نہیں ہو
پھر بھی اطمینان کا سایہ رگ رگ سے لپٹا جاتا ہے
کیسی ستھری شام ہے دیکھو
دُھلی دُھلائی
مٹّی کی سوندھی خوشبو میں
بسی بسائی

۷۵

ملی تھی خبر موسموں کو کہیں سے

چمکتی ہوئی دھوپ تیزی سے نکلی
گزرتی ہوئی بارشوں کو بلانے
ہواؤں نے ضد کی کہ ہم بھی چلیں گے
لگیں ٹھنڈکیں اپنے پیکر سجانے
ملی تھی خبر موسموں کو کہیں سے
کسی کنج گلشن میں ہیں دو دوانے
وہ برسوں کے بعد آج یکجا ہوئے ہیں
جو بیتی ہے اک دوسرے کو سنانے
درختوں نے جھک جھک کے تعظیم بخشی
بڑھے سبزہ و گل بھی آنکھیں بچھانے
کبھی ان کے چہروں کو بارش نے چوما
کبھی اُن کا دامن بسایا صبا نے
کبھی اُن کی آنکھوں میں سورج نے جھانکا
کبھی ڈال دی اُن پہ چادر گھٹا نے

بَن باس

سیّاں کو دیکھے سارا گانٔو
آگ پہ کیسے دھرے گی پانٔو

بچ جائے تو دیوی ماں ہے
جل جائے تو پاپن
جس کا رُوپ جگت کی ٹھنڈک
اگنی اُس کا درپن

سب جو چاہیں سوچیں سمجھیں
لیکن وہ بھگوان
وہ تو کھوٹ کپٹ کے بیری
وہ کیسے نادان

۶۲

اگنی پار اتر کے سیّاں
جیت گئی وشواس
دیکھا دونوں ہاتھ بڑھائے
رام کھڑے تھے پاس
اُس دن سے سنگت میں آیا
سچ مچ کا بَن باس

نہ ہے ستم کی شکایت نہ آرزوے کرم
نجانے کس کے تقاضوں پہ جی رہے ہیں ہم

چلو کہ آگ لگا دیں چمن میں ہم نفسو!
سکوتِ لالہ پہ خنداں ہے گریۂ شبنم

جو منزلوں پہ پہنچ کر بھی بے نیاز رہے
یہ اُن کا ذوقِ سفر ہے کہ تیری شانِ کرم

خیالِ منزلِ مقصود پر بھی پابندی
جنونِ راہ روی اور ہو گیا محکم

ترا خیال فروزاں ہے دیکھیے کیا ہو
خموشِ گردشِ دوراں ہے دیکھیے کیا ہو

نجانے کتنے ستارے یہ کہہ کے ڈوب گئے
سحر کا رنگ پریشاں ہے دیکھیے کیا ہو

کلی اُداس، چمن سوگوار، گُل خاموش
یہ اِنتظارِ بہاراں ہے دیکھیے کیا ہو

عجیب بات ہے اِن تیرہ تار راہوں میں
نفَس نفَس میں چراغاں ہے دیکھیے کیا ہو

بھڑک رہا ہے ابھی تک چراغِ آخرِ شب
اسے بھی صبح کا ارماں ہے دیکھیے کیا ہو

بیٹھے بیٹھے کیسا دِل گھبرا جاتا ہے
جانے والوں کا جانا یاد آجاتا ہے

بات چیت میں جس کی روانی مثل ہوئی ہے
ایک نام لیتے میں کچھ رُک سا جاتا ہے

ہنستی بستی راہوں کا خوش باش مُسافر
روزی کی بھٹّی کا ایندھن بن جاتا ہے

دفتر منصب دونوں ذہن کو کھا لیتے ہیں
گھر والوں کی قسمت میں تن رہ جاتا ہے

اب اس گھر کی آبادی مہمانوں پر ہے
کوئی آجائے تو وقت گزر جاتا ہے

مِری سہیلی

ذہین آنکھیں، کتابی چہرہ، وہ سانولی اِک اُداس لڑکی!
سفید آنچل سے تن کو ڈھانپے مرے دریچے میں جھانکتی ہے
مری سہیلی وہ ساتھ کھیلی وہ مجھ کو برسوں سے جانتی ہے
وہ ڈوبتی ہر کرن کے ہمراہ میرے گھر میں براجتی ہے
پھر اپنے ٹھنڈے نحیف ہاتھوں سے میری آنکھوں کو ڈھانپتی ہے
بتاؤ بوجھو کا کھیل ہم دونوں کھیلتے ہیں، وہ ہارتی ہے

ہزار طوفان آئے لیکن یہ دوستی کا گلاب اب تک
ہمارے ذہنوں کے آنگنوں میں اسی طرح سے مہک رہا ہے
ہزار موسم بدل گئے ہیں یہ چاہتوں کا نِکھار اب تک
ہماری آنکھوں میں گھُل رہا ہے ہمارے رُخ پہ دمک رہا ہے
ہمارے اطراف بُن دیے ہیں ہزار اندھیروں نے تانے بانے
یہ شعلۂ مہر آدمیت اسی روش سے بھڑک رہا ہے

وہ میرے کمرے میں آ کے ہر در کی زیب و زینت کو دیکھتی ہے
وہ ساری الماریوں کے خانوں کو ایک اک کر کے کھولتی ہے
مری نئی ساڑھیوں کے آنچل وہ اپنے شانے پہ ڈالتی ہے
نئے پرانے تمام گہنے بدن پہ رکھ رکھ کے آنکتی ہے
پھر آئینے کے قریب جا کر وہ بکھری زلفیں سنوارتی ہے
پلٹ کے پھر داد خواہ نظروں کو میرے دل میں اتارتی ہے

میں اُس سے کہتی ہوں آؤ بیٹھو، تمھیں زمانے کے رُخ دکھاؤں
کہاں کہاں گھوم آئی ہوں میں، وہاں کی باتیں تمھیں سناؤں
نئے طریقے تمھیں سمجھاؤں، نئی ادائیں تمھیں سکھاؤں
یہ ساری چیزیں جو دیکھتی ہوں میں ان کی بابت تمھیں بتاؤں
یہ ساڑھیاں سب فرانس کی ہیں اور ان کی گلکاریاں بھی دیکھو
یہ بٹوے سارے اطالیہ کے ہیں ساتھ گُرگابیاں بھی دیکھو
یہ نیلی کرنوں میں جھلملاتے یہ سارے ہیرے ہیں جانتی ہو
یہ موتی مصنوعی جِدتوں کے نہیں ہیں اصلی ہیں، مانتی ہو

یہ سچ ہے چیزوں کی اہمیت زندگی میں اک دورِ مختصر ہے
یہ چھوٹی شیشی کا عطر دُنیا میں سب سے مہنگا ہے کچھ خبر ہے؟
یہ سب خریداری میں نے کی ہے جو سچ کہوں لاجواب کی ہے
ہزار دکانیں دیکھ ڈالیں، تو ایک شئے انتخاب کی ہے

مگر سنو یہ تمھاری آنکھوں میں کونسی اک نمی چھپی ہے
تم اپنے آنگن سے باہر آؤ۔ یہ دیکھو دنیا بہت بڑی ہے
وہ نیچی چھت والے دونوں کمروں کے تنگ گھیرے کو توڑ آؤ
وہ گیلی مٹّی وہ کونے والا درخت اسکو بھی چھوڑ آؤ ! !
وہ کچی دیوار جس کے سایے میں سب سہانا تھا اسے بھی ڈھادو
برآمدے کی وُہ ٹوٹی چلمن جو ہو سکے کھینچ کر گرادو !
یہ میری دنیا ہے اس میں آؤ، یہ صاف شفاف دلربا ہے
سہولتیں ہیں حقیقتیں ہیں، یہاں پہ ہر رنگ کھل رہا ہے !

میری سہیلی وہ ساتھ کھیلی، وہ میری باتوں کو جانتی ہے
وہ زیرِ لب مسکرا کے آہستگی سے ہر بات مانتی ہے

وہ مجھ سے کہتی ہے آؤ ہم پھر بتاؤ بوجھو کا کھیل کھیلیں
تمھارا کہنا ہے اس جہاں میں سہولتیں ہیں حقیقتیں ہیں
حقیقتوں کا وجود کیوں ہے، سہولتوں کی نہاد کیا ہے
صداقتوں کے اصول کیا ہیں، رفاقتوں کا جواز کیا ہے
سہولتوں کی جبیں پہ روشن ہیں میرے آنسو یہ جانتی ہو
حقیقتوں کے لہو میں شامل ہیں خواب میرے یہ مانتی ہو
رفاقتوں کا جواز میرا فراق، میری جدائیاں ہیں
صداقتوں کے اصول میری ہی بھولی بسری کہانیاں ہیں
تمھارے خوابوں کی پاسباں میں ہوں میری یادوں کو تم سنبھالو
جو ہو سکے تو یہ ساری چیزیں جو تم نے دکھلائی ہیں، اٹھا لو

وہ ڈوبتی ہر کرن کے ہمراہ میرے گھر میں براجتی ہے
وہ جاگتی ہر کرن کی سنگت میں اپنے رستے سدھارتی ہے
وہ سانولی ایک اداس لڑکی جو مجھ کو برسوں سے جانتی ہے
یہ کون دیکھے، یہ کون سمجھے وہ جیتتی ہے کہ ہارتی ہے

دیوار

پیٹھ پر دونوں ہاتھوں کی گٹھری بندھی ہے
نگاہیں خجل ہیں
زبانیں ورق ہو گئی ھیں

ہم وہی ہیں
جو اپنے گناہوں کی پاداش میں
رات دن ایک دیوار کو چاٹتے ہیں

ہم اس اُمید پر جی رہے ہیں
کہ شاید یہ دیوار گر جائے

ہم سُرخرو ہوں
ہمارے گناہوں کی سب داستانیں
جو ہر اینٹ پر ثبت ہیں
منہدم ہوں
مگر ایسا ہوتا نہیں ہے

یہ دیوار ہر صبح ہم کو

عجب فتح مندی سے

للکارتی ہے

"کہاں ہیں میرے ڈھانے والے گنہ گار، آئیں، پھر آئیں

شب و روز اپنی زبانوں کے بوسیدہ خنجر مرے جسم پر آزمائیں"

اِدھر کچھ دنوں سے

تھکے ماندے سارے گنہ گار

کچھ مضطرب ہیں

دماغوں کی سیلن میں

احساس کی کونپلیں

جاگ اٹھی ہیں

وہ اتنا سمجھنے لگے ہیں

زبانوں سے دیوار

گرتی نہیں ہے

وہ یوں سوچتے ہیں

کہ اس کوششِ رائیگاں کے وسیلے کو اب ختم کر دیں

وہ اپنے ہی دانتوں سے اپنی زبانیں قلم کیوں نہ کرلیں
کسی طرح اک دوسرے کی مدد سے
بندھے ہاتھ کھولیں

ہاتھ میں ہاتھ دیں
انگلیاں انگلیوں میں سمولیں
اور مقدر سے پنجہ لڑائیں
اپنی طاقت کا فولاد
دیوار پر آزمائیں
پھر زبانوں کی نرمی کی عادی یہ دیوار ایسی گرے
کہ اس کا نام ونشاں تک نہ باقی رہے۔

یہ کیا سِتم ہے کوئی رنگ و بُو نہ پہچانے
بہار میں بھی رہے بند تیرے میخانے

فنا کے زمزمے رنج و محن کے افسانے
یہی ملے ہیں نئی زندگی کو نذرانے

تری نِگاہ کی جنبش میں اب بھی شامل ہیں
مری حیات کے کچھ مختصر سے افسانے

جو سُن سکو تو یہ سب داستاں تمھاری ہے
ہزار بار جتایا مگر نہیں مانے

جو کر گئے ہیں جُدا ایک ایک سے ہم کو
دیارِ غرب سے آئے تھے چند بیگانے

آندھیاں آئیں کئی رنگ اُبھرے
آگ برسی تو بہت پھول کِھلے

نغمے آنکھوں سے اُمڈ آتے ہیں
تیر پیوستِ گلُو جب بھی ہُوتے

اِک اشارے پہ نصیبہ جاگا
ایک جنبش پہ بنے گھر بگڑے

آپ سمجھیں جنھیں وُہ سب سے جُدا
آپ چاہیں جنھیں وہ سب سے بھلے

حلقِ زنجیر صدائیں دے گا
اذنِ گفتار ملے یا نہ ملے

ہم سے کتنوں کا سفر جاری ہے
جانے ہم کیوں سرِ منزل پہنچے

سوچتی ہوں اپنے رستے لوٹ جاؤں

سوچتی ہوں اپنے رستے لوٹ جاؤں

دیر بیشک ہو چکی ہے دیر کا افسوس کیا
خوفِ خلقِ شہر کا کانٹا کھٹکتا تھا کبھی
رفتہ رفتہ یہ خلش بھی مٹ گئی
رُوح سے رسموں کی زنجیریں تڑا لوں گی مگر
جسم کی آسائشوں سے کس طرح دامن چھڑاؤں

کس طرح میں اپنے رستے لوٹ جاؤں

لوری

دو روشنی کے چشمے
اس گھر میں بہہ رہے ہیں
دو پھول مسکرا کر !
خوشبو لٹا رہے ہیں
دو گیت ساتھ مل کے
رس رنگ گھولتے ہیں
دو تارے جگمگا کے !
رستہ دکھا رہے ہیں
دنیا کی دلکشی کا
اعلان کر رہے ہیں
محنت کی دھوپ میں یہ
پروان چڑھ رہے ہیں

آدابِ جنوں بھی عام ہوئے دیوانوں کو بتلائیں کیا
کِسی اور چلن سے گزاریں اب یہ بات انھیں سمجھائیں کیا

اب بگڑی بات بنائیں کیا اب رُوٹھے دوست منائیں کیا
اب میرؔ کی غزلیں کیا ڈھونڈھیں، غالبؔ کے شعر سنائیں کیا

اب صحرا صحرا کیا گھومیں، اب بستی بستی جائیں کیا
جو اپنے گھر میں چھوٹ گیا ہم اُس کا کھوج لگائیں کیا

کچھ اپنے پاس بھی ہوتا تب اُس در کے سوالی بن جاتے
اس دستِ تہی سے کیا مانگیں، خالی دامن پھیلائیں کیا

لب پر خموشیوں کو سجائے نظر چرائے
جو اہلِ دِل ہیں بیٹھے ہیں چُپ چاپ سر جھکائے

کہہ دو کوئی صبا سے اِدھر آج کل نہ آئے
کلیاں کہیں مہک نہ اُٹھیں پھول کھل نہ جائے

اب دوستی وہ فن ہے جو سیکھے وہی نبھائے
اور ہے وفا وہ کھیل جسے آئے وہ دکھائے

یارب ! یہ تیرگی ، یہ مسلسل صدائے مرگ
سہمے ہوئے دلوں کو کہیں راس آ نہ جائے

کچھ کہنا جُرم ہے تو خطاوار میں بھی ہوں
یہ اور بات میرا کہا ، وہ سمجھ نہ پائے

گردشِ مینا و جام دیکھیے کب تک رہے
ہم پہ تقاضا حرام دیکھیے کب تک رہے

تیرا ستم ہم پہ عام دیکھیے کب تک رہے
تلخیٔ دوراں پہ نام دیکھیے کب تک رہے

چھا گئیں تاریکیاں، کھو گیا حُسنِ نظر
وعدۂ دیدارِ عام دیکھیے کب تک رہے

اہلِ خرد سست رو، اہلِ جنوں تیز گام
شوق کا یہ اہتمام دیکھیے کب تک رہے

صبح کے سورج کی ضو دیکھیے کب تک نہ آئے
دہر پہ یہ رنگِ شام دیکھیے کب تک رہے

مقامِ ہوش و خرد سے آگے دل و نظر جا کے تھک گئے ہیں
ملا ہے جب بحرِ زندگانی تو خود سفینے بھٹک گئے ہیں

نظامِ میخانہ لُٹ چکا ہے، ہر ایک ساقی بنا ہوا ہے
شکستِ ساغر ہے حرفِ آخر جہاں پہ ساغر چھلک گئے ہیں

مری غریبی کی خیر یا رب! مجھے مقاماتِ بُوذری دے
بڑے بڑے صاحبِ بصیرت یہاں پہنچ کر بھٹک گئے ہیں

چلو کہ اس جستجو میں نکلیں، بہار آخر کدھر سے گزری
کہ اس گلستاں میں رہنے والے تو راہ تک تک کے تھک گئے ہیں

جاں دینا بس ایک زیاں کا سودا تھا
راہِ طلب میں کِس کو یہ اندازہ تھا

آنکھوں میں دیدار کا کاجل ڈالا تھا
آنچل پہ اُمید کا تارا ٹانکا تھا

ہاتھوں کی بانکیں چھن چھن چھن ہنستی تھیں
پیروں کی جھانجھن کو غصہ آتا تھا

ہَوا سکھی تھی میری۔ رُت ہمجولی تھی
ہم تینوں نے مل کر کیا کیا سوچا تھا

ہر کونے میں اپنے آپ سے باتیں کیں
ہر پہچل پر آئینے میں دیکھا تھا

شام ڈھلے آہٹ کی کرنیں پھوٹی تھیں
سُورج ڈوب کے میرے گھر میں نکلا تھا

نائٹ شِفٹ

(گلف میں کام کرنے والے ایک پاکستانی مزدور کے نام)

سنو بھائی میرے

تمازت سے دہکا ہوا

دن تو گزرا

یہ ہنگامِ شب ہے

سمندر کی حدّت

جہاں تھی وہیں ہے

ہر اک ذرّۂ خاک

آتش بہ لب ہے

ابھی دیکھتے دیکھتے

رات ڈھل جائے گی

جسم رُک جائیں گے

اگر رک گئے تو

یہ تھک جائیں گے

اِن مشینوں کے جنگل میں
پھنکارتے ریت کے اژدہے
اِک نم آلود ٹھنڈک سے
ڈھک جائیں گے
پھر بگولوں سے دامن چھڑا کر ہوا
مژدۂ جانفزا لیکے لہرائے گی
کتنی راتوں سے رُوٹھی ہوئی
سانولی مدھ بھری
نیند کی ایک نیلم پری
تم سے ملنے ہمارے دِلی آئے گی
گرد آلود پلکیں
چومے گی وہ
تر بتر بازوؤں ہی میں
جھولے گی وُہ
اور نس نس میں گھل جائے گی
ہمہ وقت محنت

ہمہ وقت پیسا کمانے کی حسرت
ذرا دیر کو
پیچھے ہٹ جائے گی
دیکھتے دیکھتے
ادھ کھلے ہاتھ سے
ریڈیو کا کھلونا بھی گر جائے گا
خواب تم دیکھنا
اُس کا شور اُس کا نغمہ صداؤں میں صحرا کی مل جائے گا
خواب تم دیکھنا
خواب دلکش، دل آویز، معصوم ستھرے
اس سے پہلے کہ سورج کا نیزہ
ہر اک خواب کے دل میں اُترے
سنو بھائی میرے !

ایک لڑکی

کیسا سخت طوفاں تھا
کتنی تیز بارش تھی
اور میں ایسے موسم میں
جانے کیوں بھٹکتی تھی
وہ سڑک کے اُس جانب
روشنی کے کھمبے سے !
سر لگائے اِستادہ
آنے والے گاہک کے
اِنتظار میں گم تھی !
خال و خد کی آرائش
بہہ رہی تھی بارش میں
تیر نوکِ مژگاں کے
مِل گئے تھے مٹّی میں

گیسوؤں کی خوش رنگی
اڑ رہی تھی جھونکوں میں
میں نے دِل میں یہ سوچا
آب و باد کا ریلا !
اُس کو راکھ کر دے گا
یہ سجا بنا چہرہ !
کیا ڈراؤنا ہو گا
پھر بھی اس کو لے جانا
آنے والے گاہک کا
اپنا حوصلہ ہو گا

بارشوں نے جب اُس کا
رنگ و رُوپ دھو ڈالا
میں نے ڈرتے ڈرتے پھر
اس کو غور سے دیکھا
سیدھا سادا چہرہ تھا

بھولا بھالا نقشا تھا
رنگ کم سنی جس پر
کیسے دُھل کے آیا تھا
زرد پھول سا پتا
گیسوؤں میں اُلجھا تھا
شبنمی سا اک قطرہ
آنکھ پر لرزتا تھا
راکھ کی جگہ اُس جا
اک دیا سا جلتا تھا

مجھ کو یوں لگا ایسے!
جیسے میری بیٹی ہو
میری ناز کی پالی
میری کوکھ جائی ہو
ڈال سے بندھا جھولا
طاق میں سبھی گڑیاں

گھر میں چھوڑ آئی ہو
تیز تیز چلنے پر
میں نے اُس کو ٹوکا ہو
ہاتھ تھام لینے پر!
میرا اُس کا جھگڑا ہو
کھو گئی ہو میلے میں
بہہ گئی ہو ریلے میں
اور پھر اندھیرے میں
اپنے گھر کا دروازہ
ڈھونڈ نہ دیکھ پائی ہو!

دفعتاً یہ دل چاہا
اُس کو گود میں بھر لوں
لے کے بھاگ جاؤں میں
ہاتھ جوڑ لوں اُس کے

چوم لوں یہ پیشانی !
اور اُسے مناؤں میں
پھر سے اپنے آنچل کا
گھونسلا بناؤں میں
اور اُسے چھپاؤں میں

شورشِ قلب و نظر آخر زباں تک آ گئی
بات یہ اِتنی سی تھی، لیکن کہاں تک آ گئی

ماتمِ حُسنِ چمن، اہلِ چمن کرتے رہے
بڑھتے بڑھتے آگ لیکن باغباں تک آ گئی

رات ویراں، کہکشاں حیراں، مہ و انجم اداس
لو زمیں کی بات آخر آسماں تک آ گئی

کہتے کہتے حالِ دل اِک واقعہ سا بن گیا
سُنتے سنتے بات آخر داستاں تک آ گئی

اور ہی طرزِ جفا سیکھیں فلک کی گردشیں
اب وفا بھی منزلِ سود و زیاں تک آ گئی

آج کی بات

آج کی بات نئی بات نہیں ہے ایسی
جب کبھی دل سے کوئی گزرا ہے تو یاد آئی ہے
صرف دل ہی نے نہیں، گود میں خاموشی کی
پیار کی بات تو ہر لمحے نے دہرائی ہے

چپکے چپکے ہی چٹکتے دو اشاروں کے گلاب
دھیمے دھیمے ہی سلگتے دو تقاضوں کے الاؤ!
رفتہ رفتہ ہی چھلکتے دو اداؤں کی شراب
دھیرے دھیرے ہی نگاہوں کے خزانے بکھراؤ

بات اچھی ہو تو سب یاد کیا کرتے ہیں
کام سلجھا ہو تو رہ رہ کے خیال آتا ہے

درد میٹھا ہو تو رُک رُک کے کسک ہوتی ہے
یاد گہری ہو تو تھم تھم کے قرار آتا ہے

دِل گزرگاہ ہے آہستہ خرامی کے لیے
تیز گامی کو جو اپناؤ تو کھو جاؤ گے
اِک ذرا دیر ہی پلکوں کو جھپک لینے دو
اس قدر غور سے دیکھو گے تو سو جاؤ گے

ہمارے اور تمہارے راستوں میں

ہمارے اور تمہارے راستوں میں
کہیں بھی آشنا سورج نہیں ہے
بہ ظاہر ساتھ چلتے جا رہے ھیں
کوئی بھی مشترک سایہ نہیں ہے

ہماری شخصیت کے آئینے میں
ہمارے عکس سب چٹخے ہوئے ھیں
ہمارے جسم کے بوجھل تقاضے
ہماری روح تک گہنا چکے ہیں

قصور اس میں تمہارا ہے نہ میرا
سُنا ہے دو ستاروں کا قرینہ

بہت منحوس ہو جاتا ہے اکثر
وہ آپس ہی میں ٹکرا کر اُلجھ کر !
بکھر جاتے ہیں یونہی آسماں پر

اگر وُہ دور ہوں اک دوسرے سے
تو بڑھ جاتی ہے اُن کی جگمگاہٹ
کبھی لعلِ جبینِ آسماں وُہ
کبھی حُسنِ نگاہِ رہرواں وُہ
ہمیشہ کاروانوں کے نشاں وُہ

ہم اپنے قُرب کے کمزور دھاگے
جھٹک کر توڑ دیں ہمت نہیں ہے
یہ زہراب پی ہی لیں جرأت نہیں ہے
کبھی سچ بول دیں عادت نہیں ہے

وہ سامنے ہی تو ہے منزلِ اُمید مگر
بھٹک گئے ہیں اندھیروں میں آج اہلِ نظر

بڑی عجیب ہے اس زندگی کی راہ گزر
نہ ابتدائے سفر ہے نہ انتہائے سفر

نقاب چہرۂ شب اٹھ چکا مگر پھر بھی
اُداس اُداس اُجالے بجھی بجھی ہے سحر

یہ کائنات کہن اور پھر جمیل اتنی
ہے تیری شانِ خدائی کہ میرا حسنِ نظر

نشانِ جادۂ منزل مجھے ملا بھی تو کیا
بھٹک رہے ہیں ابھی تک مرے شریکِ سفر

ترے خیال، تری جستجو، تری خواہش
تفکراتِ زمانہ میں چھپ گئے یکسر

یہ بھی نذرِ ستمِ گردشِ دوراں ہو جائے
یوں بہار آئے کہ دل اب کے بیاباں ہو جائے

اشک برساؤ کہ روشن ہوں ستاروں کے چراغ
مسکراؤ کہ ہر اک ذرّہ گلستاں ہو جائے

چشمِ پرخواب کو حسرت کہ وہ خوں ناب بنے
دامنِ گل کو تمنّا کہ گریباں ہو جائے

آتشِ غم سے دہک جاتے ہیں گل کے سائے
سیرِ گل سے جو صبا یونہی پریشاں ہو جائے

دل کی دنیا سے خوشی چھین کے جانے والو
کچھ نہ کچھ دل کے بہلنے کا بھی ساماں ہو جائے

تعمیلِ وفا کا عہد نامہ

(لسانی فسادات سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے)

خاموش ہیں صاحبانِ منصف
حیران ہیں رہبرانِ مخلص
لاشوں کا کوئی وطن نہیں ہے
مردوں کی کوئی زباں نہیں ہے
اُجڑے ہوئے گھر کی خامشی میں
نوحے کی ندائیں ایک سی ہیں
ماتم کا ہے لہجہ ایک جیسا
رونے کی صدائیں ایک سی ہیں
آنکھوں کی سیاہیاں ہیں مدھم
پلکوں کی قلم ہے پارہ پارہ
خوناب ہوا ہے مصحفِ رُخ
ہونٹوں کے ہیں دائرے شکستہ

چہرے کی کتاب کے ورق پر !
زخموں نے جو حاشیے لکھے ہیں
ان سب کی زباں ہے ایک جیسی
وہ سب کی سمجھ میں آگئے ہیں
اِک پل کے لیے شبِ الم میں
چمکیں گے تسلیوں کے آنسو
کچھ دیر دریدہ دامنوں میں !
مہکے گی ستائشوں کی خوشبو
پھر خاک کی جلد میں چھپے گا
تعمیلِ وفا کا عہد نامہ !
مِل جائیں گی وارثوں کو یادیں
ہو جائے گا قافلہ روانہ

قربتوں سے کب تلک اپنے کو بہلائیں گے ہم
ڈوریاں مضبوط ہوں گی، چھوٹتے جائیں گے ہم

تیرا رُخ سایے کی جانب، میری آنکھیں سوئے مہر
دیکھنا ہے کِس جگہ، کس وقت مل پائیں گے ہم

گھر کے سارے پھول ہنگاموں کی رونق ہو گئے
خالی گلدانوں سے باتیں کر کے سو جائیں گے ہم

ادھ کھُلی تکیے پہ ہوگی، علم و حکمت کی کتاب
وسوسوں، وہموں کے طوفانوں میں گِھر جائیں گے ہم

اُس نے آہستہ سے زہرا کہہ دیا دِل کِھل اُٹھا
آج سے اس نام کی خوشبو میں بس جائیں گے ہم

اپنے بیٹے علیؑ کے نام

وہ صبح ابھی تلک ہے روشن
وُہ رات تو اب بھی ہے منوّر
جس دن تری نرم آہٹوں سے
جاگا در و بام کا مقدّر !
یہ تیری ہی ذات کی کشش تھی
یہ تیرے وجود کا تھا انعام
صحرا ہیں فلک پہ اور خلا میں
ہر جا پہ لکھا ہوا تھا اک نام
یہ نام صداقتوں کا حامل
یہ نام عبادتوں میں شامل
آئی ہوئی ہر کتاب میں یہ
بھیجے گئے ہر نصاب میں یہ

یہ نام بہ طرزِ نکہتِ گُل
سانسوں میں مری مہک رہا تھا
یہ نام میری کتابِ رُخ پر
سُرخی کی طرح چمک رہا تھا
جاگی ہوئی سَاعتوں کی دولت
دامن میں مرے بھری ہوئی تھی
ماتھے پہ لگن کی دھوپ روشن
آنکھوں میں تھکن کی چاندنی تھی

قدرت نے تجھے زبان دی تھی!
میں نے تجھے بولنا سِکھایا
فطرت سے ملی تھی دولتِ عقل
میں نے تجھے سوچنا سکھایا
انگلی کے سہارے سے اُٹھایا
باہوں کے حصار میں بٹھایا

لوری کے سُرور میں سُلا کر
بوسوں کی بہار میں جگایا
جو وقت کہ ساتھ ساتھ گزرا
وہ وقت ہی مایۂ بقا تھا
ہر رُخ میں تری شباہتیں تھیں
ورنہ مِرے پاس اور کیا تھا

گزرے ہیں نجانے دَور کتنے
آئینہ بنا رہا ہے مجھکو
خود اپنے ہی عکس سے مِری جاں
کچھ وہم سا آ رہا ہے مجھکو

دِن رات کی گردشِ مسلسل
شانوں پہ ٹھہر گئی ہے ساری
چہرے کا پگھل رہا ہے سونا

بالوں پہ برس رہی ہے چاندی
لیکن یہ ہے حُسنِ آدمیّت
تو آکے مجھے گلے لگا لے!
انگلی کے سہارے سے اُٹھا لے
بانہوں کے حصار میں بٹھا لے

یہ معجزۂ نگارِ ہستی!
اب تُو مجھے جاگنا سکھا دے
بوسوں سے اگر نہ جاگ پاؤں
لوری کے سُرور میں سُلا دے

وہ ایک دن جب کہ میرے ماتھے پہ ایک سورج چمک رہا تھا

وہ ایک دن جب کہ میرے رخسار چاندنی میں نہا گئے تھے

وہ ایک دن جب کہ میری آنکھوں میں سارے تارے سمٹ گئے تھے

وہ ایک دن جب کہ ساری دنیا میں سب سے اچھا تھا میرا چہرہ

(۲ فروری ۱۹۵۹ء)

اپنے چھوٹے بیٹے

نعمان

کے نام

یہ دَور وہ ہے سوائے اپنے
ہر ایک شئے کتنی بے حقیقت
خود اپنی آواز صوتِ عَالم!
ہر آئینے میں بس اپنی صُورت
ہر ایک جھونکے میں اپنی خوشبُو
ہر ایک موسم میں اپنی رنگت
یہ دَورِ آشوبِ زندگی میں
خُدا کی بخشی ہوئی وہ نعمت
جسے جوانی کا رُوپ دے کر
ہے خود پہ نازاں نگارِ فطرت
جہاں تمنّا، نمازِ دِل ہو
جہاں ہو خواہش محض عبادت
میں ایسے عالم میں تم کو جانم
اگر کروں بھی تو کیا نصیحت

بُھولیں اگر تجھے تو کہاں جائیں کیا کریں
ہر رہگذر میں تیرے گزرنے کا حُسن ہے

درسِ فراموشی

مجھے بھول جاؤ

تمنّا کے موتی طلب کے یہ لعل و گہر

یہ چاہت کی چاندی امنگوں کا زر

یہ نگاہوں کی قوسِ قزح آنسوؤں کے بھنور

یہ خیالوں سے رنگین محل آرزو سے سجے بام و دَر

عمر بھر ساتھ دینے کی یہ روشنی

عمر بھر ساتھ چلنے کی یہ رہگذر

کسی پر بھروسے کا اک خوبصورت دِیا

کسی عرضِ مطلب کی ایک بیش قیمت نظر

بُھلا دو اُنھیں، اس طرح سے بھُلادو

انہیں وہم کی گرد میں یوں چھُپادو

انہیں وقت کی خاک میں یوں مِلادو

کہ احساس کے سارے ذرّے

اور یادوں کے یہ سنگ ریزے
نہ اب زندگی کا سہارا بنیں
نہ اب آسماں کا سِتارا بنیں
اور وہ دِل جو اس درس سے آشنا بھی ہوا، بہرہ ور بھی ہوا
آج اپنے مقدّر پہ خُود مطمئن زندگی کی روش پہ رواں ہے
اور وہ دِل کہ جس نے اسے ایسا درسِ حقیقت دیا تھا
آج بھی ان فراموشیوں کے سبق پر
اپنی یادوں کی چادر لپیٹے ہوئے سوچتا ہے
یہ امانت ہے اک ہم سفر کی
یہ امانت ہے اک بہرہ ور کی
یہ امانت وہ ہے جس کا اظہار کیا
صِرف مبہم سا اقرار ہی

اِک طرح کی خیانت نہیں ہے تو کیا ہے

یہ ہوا کا اِک جھونکا

یہ ہوا کا اِک جھونکا
دُوریوں کے صحرا سے
فاصلوں کے جنگل سے
روز شام آتا ہے
کتنے بیتے لمحوں کے!
آئینے دکھاتا ہے
تھم کے چھُو کے آتا ہے
میرے گھر کے آنگن کی
نرم گرم مٹّی کو!!
جس میں ذرّے چاندی کے
کِس طرح چمکتے تھے
اور جس کے سینے پر
ہاتھ کونپلوں جیسے
اُنگلیوں کی جنبش سے!

اپنے نام لکھتے تھے!
یہ ہوا کا اک جھونکا
تھم کے چھو کے آتا ہے
صبح آشنا کیسی
شام ملتفت کتنی
رات مہرباں کیسی
ہر نظر کا اک انعام
اک تشکّرِ صد رنگ
اک شکایت بے نام
یہ ہوا کا اک جھونکا
تھم کے چھو کے آتا ہے
ان گھروں کے در دیوار
جن کے سائے میں میں نے
زندگی کا ہر دکھ سکھ
کس طرح سے کھویا ہے
کس طرح سے پایا ہے

منزلوں کی بے تابی!
رہ گذر کی دشواری!!
رات کے اندھیروں میں
اِک سفر کی تیاری
تار میرے آنچل کے
خون میری آنکھوں کا
سایہ سرپرستی کا
ڈوبتا ہوا ہر جا
یہ ہوا کا اک جھونکا
کتنے بیتے لمحوں کے
آئینے دکھاتا ہے
یہ ہوا کا اِک جھونکا
مجھ سے مِل کے جاتے وقت
رُک کے چُوم لیتا ہے
جگمگاتے دو چہرے!

اور مجھ سے کہتا ہے

آسماں کو دیکھو ! !

یہ ردائے غمگیں ہے

بارشوں کا پیراہن !

اور زمین کو چومو ! !

یہ فگارِ سینہ ہی !

کونپلوں کا ہے مسکن

پیچ و خم کے گہنوں سے

زندگی سنورتی ہے !

ایک رُخ جو سنولائے

ایک مانگ سجتی ہے

تم نے رات دیکھی ہے

تاکہ ان کی آنکھوں میں !

صبح مسکرا جائے

تم نے خاک چھانی ہے

تاکہ اُن کے چہروں پر

رنگِ گُل بکھر جائے
جو تمھیں نہ مِل پایا ! !
اِن کا وہ مقدّر ہے

کہاں ہے روشنیٔ حُسنِ رُوحِ انسانی
مہیب رات کہیں خود سحر نہ بن جائے
چراغِ ظلم و ستم خود نہ راہ دِکھلا دے
یہ انتظار اب عزمِ سفر نہ بن جائے

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم

(رومی)

ٹھٹھکتے نہیں پھول گلچیں کے ڈر سے
تمسخر عیاں نرگسِ چشمِ تر سے
شرارے ہیں پیدا، گلوں کے جگر سے
بھڑکتے ہیں جو پھر نسیمِ سحر سے
نسیمِ سحر کس طرح روک دوگے
مشیّت کے فرمان کو کیا کروگے؟

ایران

"زخاکِ سعدیٔ شیراز بوئے عشق آید"

مِری زمیں بھی تمھاری زمیں سے مِلتی ہے
مری زبان سے رشتہ تمھارے لفظوں کا
تمھارے شعر ابھی تک مری کتابوں میں
روایتوں سے تعلّق، مرے فسانوں کا!

دریدہ پیرہنی، بے بسی بھی ایک سی ہے
برہنہ پائی، شکستہ دلی بھی ایک سی ہے
ہر ایک دیدۂ پُرآب ایک جیسا ہے
ہر اک خیال، ہر اک خواب ایک جیسا ہے
اگر ہے فرق کہیں پر تو بے ارادہ ہے
کہ میرے شاہوں کی تعداد کچھ زیادہ ہے

جو تار تار کرے ہر لباسِ محرومی
خدا کرے وہ دستِ جنوں مجھے مل جائے

تمہارے کوچہ و بازار میں جو مہکی ہے
وہ بوئے عشق کبھی میری خاک سے بھی آئے

نظر بھر کے تم اُن پہاڑوں کو دیکھو!

ذرا دیر کو اپنا بہتا لہو اپنی مٹّھی میں لے لو
ذرا دیر کو اپنے پیروں کے کانٹے فراموش کر دو
نظر بھر کے پھر اُن پہاڑوں کو دیکھو ——
ہماری زمیں پر پہاڑوں کا بھی سلسلہ ہے
دہانوں سے جن کے دھواں اُٹھ رہا ہے
وہاں پر ہماری تمھاری طرح کتنے شوریدہ سر ہیں
کئی سال سے اپنے گھر اپنے شانوں سے باندھے ہوئے دربدر ہیں
وہاں سنگ رنگ شکستہ کی تصویر ہرگز نہیں ہے
وہاں ہر رگِ سنگ سے وہ لہو بہہ رہا ہے
جسے جذب کرنے پہ کوئی بھی راضی نہیں ہے
یہاں مرنے والوں کی تعداد ہے اذنِ نوحہ گری ہے
پرسشِ غم ہے اُمید چارہ گری ہے

وہاں ہُو کا عالم ہے بس خامشی ہے
وہاں خامشی صرف گولی کی آواز سے ٹوٹتی ہے
نظر بھر کے تم ان پہاڑوں کو دیکھو

نشانِ لالہ و گل تم مٹا نہیں سکتے
چمن میں آگ لگی تھی کہ آ گئی برسات

ویت نام

دیکھو تو خرامِ پا فگاراں
کانٹوں کی زباں پہ گُل کھِلے ہیں

ہر دیدۂ تر کے لعل و گوہر
ہر سینۂ چاک پر سجے ہیں

ویرانے میں زندگی بسی ہے
سنّاٹے میں دل دھڑک رہے ہیں

تاروں میں اِک آگ سی لگی ہے
ذرّوں کے چراغ جل رہے ہیں

ہر ظلم کی وسعتوں کے آگے
اِک درد کے کتنے حوصلے ہیں

جو سر کہ قلم ہوئے نشاں ھیں
جو خاک ہوئے وہ راستے ہیں

برسوں سے ہے موت رقص فرما
برسوں سے یہ لوگ جی رہے ہیں

ویت نام

(دورانِ جنگ پلنے والے بچّے کا گیت)

جب سے میری آنکھ کھلی ہے
میں نے اپنی اس دنیا میں
آگ برستی ہی دیکھی ہے
خندق کی اس گود میں مَیں نے
جینا سیکھا رہنا سیکھا
ہر دکھ درد کو سہنا سیکھا
جب سے مَیں نے کہنا سیکھا
میرے لبوں سے یہ نکلا ہے
میری بستی پر چھائی یہ چھت آخر کب نیلی ہو گی
کب اس میں تارے چمکیں گے
اور کب دُودھ سے بادل جو میں سوچوں گا وہ بن جائیں گے
اور کب روشن دھوپ کے ذرّے میری مٹھی میں آئیں گے

کب کھیتوں میں دوڑ کے میں بھی ہوا کے جھونکوں کو چُوموں گا
اور کب چاند کی ٹھنڈک کو میں اپنے ہاتھوں سے چھُو لوں گا

میں نے سُنا ہے
مجھ کو یقیں ہے
اس دُنیا میں سورج چاند، ہوا پر کوئی قید نہیں ہے

جنوبی افریقہ

(ایک حریت پسند کے پھانسی دیے جانے
کی تصویر دیکھ کر)

چلو کسی آسماں کے نیچے کسی نے سنگِ وفا تو رکھا
چلو کہیں بزمِ عاشقاں میں کسی نے پورے تو کر دکھائے
وہ سارے ارکانِ عشق جو بس کہانیاں تھے نشانیاں تھے

چلو کسی کی جبیں تو آخر کو دار سے چاند بن کے اُبھری
چلو کسی کی گھٹی ہوئی سانس مثلِ نکہت فضا میں بکھری
کسی کے ہونٹوں کے زرد پھولوں پہ عہد کی تازگی سجی تو
کسی کے رخسار کی چٹانوں پہ شبنمِ خونِ دل گری تو !
زباں کی مشعل کی لَو تو دیکھو یہ کس کے شانوں کو چومتی ہے
بدن کی دولت تھمی ہوئی نبض کے سہارے پہ جھومتی ہے
کسی کے بے جان بازوؤں نے کیا تو لہرا کے اک اشارہ
چلو کسی کی اُمڈتی آنکھوں نے ایک دستہ تو دیکھ ڈالا !

اِحتساب

وہ دو فرشتے کہ جن کی خدمات وقفِ آدم تھیں تا قیامت
وہ دو فرشتے جہانِ فانی سے سوئے افلاک اُڑ گئے ہیں
وہ دونوں ربِ جہاں کے دربار میں پریشان سے کھڑے ہیں
وہ ہاتھ خالی ہیں جن میں اعمال کی کتابیں تھیں اور قلم تھے
وہ کہہ رہے ہیں کہ ربِ عزت، رحیم و دائم، کریم و قائم
ہماری خدمات ہم سے لے لے ہمیں سبکدوشِ فرض کر دے
کہ تیرا نائب وہ تیرا مظہر
شمارِ اعداد و احتسابِ گُنہ کی لذت میں ایسا گُم ہے
کہ ہم سے آگے نکل گیا ہے
ہمارا سامانِ علم و حکمت اسی کی تحویل میں ہے اور ہم
تری نگاہِ کرم کے محتاج ہیں، اشارے کے منتظر ہیں!

اندریں شہر مرا سایۂ دیوارے نیست

آسماں جیسے بیساکھیوں پر کھڑا ہے
شدّتِ غم سے پیراہنِ نیلگوں پارہ پارہ ہوا ہے
اس کی پلکوں کی چاندی پگھل کر
آنسوؤں کے نمک میں گھُلی جا رہی ہے

"ہوا رو رہی ہے ..

یہ سمندر، یہ بپھرا ہوا دیوتا
اس طرح سینہ کوبی میں مصروف ہے
سارے عالم کو جیسے نگل جائے گا
اسکے ماتم کی آواز رہ رہ کے ہر سمت سے آ رہی ہے

"ہوا رو رہی ہے ...

بس زمیں سو رہی ہے
دونوں ہاتھوں سے اپنا برہنہ بدن ڈھانپ کر
اس کے زخمی لبوں پہ مدد کی پکاریں لہو کی طرح جم گئی ہیں

اور اذیت میں ڈوبی کراہیں بھی کچھ تھم گئی ہیں
دودھیا کُندنی جسم پر جابجا نیلے دھبّے پڑے ہیں
ناخنوں کے نشاں، نقشِ دنداں
بدن کے تراشوں سے اُلجھے ہوئے ہیں
اس کے روندے ہوئے جسم سے صرف کچّے لہُو کی مہک آ رہی ہے

"ہوا رو رہی ہے ......"

(مارچ ۱۹۷۷ء)

یہ خال و خد مِرے اپنے

ہر ایک جسم مرا ہے، ہر ایک جان مری
یہ خال و خد مرے اپنے یہ آن بان مری
ستم تو یہ ہے کہ مظلوم میں ہوں ظالم میں
ہر ایک زخم مجھی سے حساب مانگے گا
ہر ایک داغ مری آستیں سے جھانکے گا

ہزار ہا مری پیشانیوں کے چاند بجھے
ہزار ہا مرے لب ہمکنارِ زہر ہوتے
ہزار ہا مرے جسموں کی ڈالیاں ٹوٹیں
ہزار ہا مری آنکھوں کی مشعلیں ڈوبیں

جہاں پہ آگ لگی ہے، وہاں کھلونے تھے
جہاں پہ خاک اڑی ہے، وہاں پہ جھولے تھے

جہاں پہ سر دہیں سینے وہاں پہ چوکھٹ تھی
جہاں پہ بند ہیں آنکھیں وہاں دریچے تھے
میں اس دُھویں میں کہاں اپنی لاش کو ڈھونڈوں
میں اس ہجوم میں کیسے شمارِ زخم کروں ؟

ستم تو یہ ہے کہ مظلوم میں ہوں، ظالم میں
ہر ایک زخم مجھی سے حساب مانگے گا !
ہر ایک داغ میری آستیں سے جھانکے گا

(مارچ - ۱۹۷۱ء)

ہائے وہ بُت کہ تراشا تو بہت دُھوم مچی
اور ٹوٹا تو کوئی شور نہ اُٹھا لوگو .

دیکھ لو یہ بھی ہے اِنعامِ شکستہ پائی
گھر چلے آنے کا رستہ نہیں ملتا لوگو

تنِ نحیف سے انبوہِ جبر ہار گیا

(۲۵ مارچ سنہ ۱۹۷۱ء)

اب آنسوؤں کے دھندلکوں میں روشنی دیکھو
ہجومِ مرگ سے آوازِ زندگی کو سُنو
سنو کہ تشنہ دہن مالکِ سبیل ہُوئے
سنو کہ خاک بسر وارثِ فصیل ہُوئے
رِدائے چاک نے دستارِ شہ کو تار کیا
تنِ نحیف سے انبوہِ جبر ہار گیا
سُنو کہ حرص و ہوس، قہر و زہر کا ریلا
غبارِ خار و خس و خاک ہی نے تھام لیا
سیاہیاں ہی مقدر ہوں جن نگاہوں کا
خدا بچائے اِن آنکھوں کی شعلہ باری سے
ڈرو! کہ زرد رُخاں، نیم جاں و خستہ تناں
ھزار بار مرے اور لاکھ بار جیے!

وہ لوگ جن کو میسر نہ آئے مرہم وقت !
وہ لوگ تلخیٔ تقدیر بانٹ لیتے ھیں
وہ ہاتھ جن پہ ہو نفرت کا زنگ صدیوں سے
وہ ہاتھ لوہے کی دیوار کاٹ دیتے ہیں

شکوۂ دار و رسن باعثِ رسوائی ہے
ہم نے ہر حال میں جینے کی قسم کھائی ہے

کچھ دِن ہوئے اس گھر میں تھی

کچھ دِن ہوئے اس گھر میں تھی
قربت کی اک ننّھی پری
کرنوں کا سر پر تاج تھا
ہاتھوں میں پھولوں کی چھڑی
جس سے ہمیں چھوتی تھی وہ
یوں کھیلتی پھرتی تھی وہ
اس طرح خوش رہتی تھی وہ
جیسے کہ اپنے گھر میں ہو !
اک شب نجانے کیا ہوا
قربت کی وہ ننھی پری
بس کھیلتے ہی کھیلتے !
بستر میں غائب ہو گئی
ایسی گئی ، ایسی گئی
جیسے کہ سچ مچ مر گئی !

اور آج کل جو گھر میں ہے
وہ قرب کا عفریت ہے
چہرہ ہے جس کا ہشت رُخ
ہاتھوں میں اِک زنجیر ہے
ہر حلقۂ زنجیر میں ! !
اِک سانپ ہے بیٹھا ہوا
جس سے ہمیں ڈستا ہے وہ
پھر دیکھ کر ہنستا ہے وہ
اس طرح خوش رہتا ہے وہ
جیسے کہ اپنے گھر میں ہو

عمر ساری غمِ دُنیا میں بسر ہوتی ہے
تب کہیں جاکے ترے غم کی سحر ہوتی ہے

چاہتے ہم تو ترا نام بھی لے سکتے تھے
یہ خلش آج بہ اندازِ دِگر ہوتی ہے

جس کو انساں کی محبت کا سہارا مل جائے
وہ زمیں سجدہ گہ شمس و قمر ہوتی ہے

کون جانے ترا اندازِ نظر کیا ہو جائے
دل دھڑکتا ہے تو دنیا کو خبر ہوتی ہے

CONCORDE

یہ سُبک راج ہنسوں کا راجا
تیز رفتار آواز سے ہے
کبر و نخوت سے گردن اٹھائے
مجھ کو لے کر اُڑا بادلوں میں !
آیتیں میرے لب پر رواں ہیں
خوف سا مجھ پہ چھایا ہوا ہے
بند آنکھیں کیسے جاگتی ہوں
تیز اُس سے کہیں بھاگتی ہوں
اور یہ سوچ کر مسکراؤں
کیسا دھوکا اسے دے رہی ہوں
قبل اس کے کہ یہ مجھ کو تجھ تک
اپنے پنکھوں پہ بھٹلا کے لائے
میں کئی بار تجھ سے مل آئی !
اس کو یہ کوئی کیسے بتائے

کون اس راز کے چہرے سے اٹھائے گا نقاب
رات سر دھنتی ہے ٹوٹے ہوئے تارے کے لیے
آہی جاتا ہے زمانے میں اک ایسا ہنگام
موجِ طوفاں بھی تڑپتی ہے کنارے کے لیے

نوحہ

اس شام کا وہ منظر، آنکھوں میں رہ گیا ہے
سب لوگ چُپ تھے لیکن ہر شخص بولتا تھا

کانوں میں تھم گئی تھی جیسے اذانِ مغرب
دو وقت مل رہے تھے اِک ساتھ چھوٹتا تھا

جب رات ڈھلتے ڈھلتے سب لوگ واپس آئے
ہر مہرباں نظر سے کچھ خوف آ رہا تھا

ٹھنڈک میں بادلوں کی پھر نیند آ گئی تھی
جاگے تو سارے گھر میں پانی بھرا ہوا تھا

(۴ جون ۱۹۵۳ء)

یہ حکم ہے کہ اندھیرے کو روشنی سمجھو
ملے نشیب تو کوہ و دمن کی بات کرو

بہار آئے تو چپ چاپ ہی گزر جائے
نہ رنگ و بو کی نہ سرو سمن کی بات کرو

نہیں ہے مے نہ سہی چشم التفات تو ہے!
نئی ہے بزم طریق کہن کی بات کرو

خزاں نے آکے کہا میرے غم سے کیا حاصل
جہاں بہار لٹی اس چمن کی بات کرو

قدم قدم پہ فروزاں ہیں آنسوؤں کے چراغ
انھیں بجھاؤ تو صبح وطن کی بات کرو

جہاں پہ مہر خموشی لگی ہے ہونٹوں پر!
جو کر سکو تو اسی انجمن کی بات کرو

مناجاتوں کی شب میں

خداوندا
مُناجاتوں کی شب میں
مرادوں منّتوں کے دن میں،
یہ ہنگامہ کیسا ہے
میری بے خواب آنکھوں سے
بجائے رنگِ الفت
خونِ حسرت کیوں چھلکتا ہے
بجائے بوسۂ عہدِ وفا
یہ میرے چہرے پر
نشانِ زخم کیسا ہے
اِسی دن کے لیے
سب دِن گنے تھے
اِسی شب کے لیے

ہر شب یہی بھی

اسی مہلت کی خاطر

جان و دِل مصروف رکھے تھے

اسی لمحے کے باعث

کیسے کیسے دَور دیکھے تھے

بہ طرز نغمہ ہائے رنگ و بُو

اب میرے کانوں میں

یہ کیسا شور ماتم ہے

یہ کیسا لحنِ نالہ ہے

خداوندا تو عزّ و جل

بنائے رنگ و ہستی ہے

تری رحمت توازن ہے

بلندی ہے نہ پستی ہے

تو رب العالمیں ہے

دو جہاں پر تیرا سایہ ہے

یہ کس کی بددعا ہے
جو میرے سر پہ مسلّط ہے
بتا یہ کونسا آسیب ہے
جو مجھ پہ چھایا ہے

کب تک جاں کو خاک کرو گے، کتنے اشک بہاؤ گے
اتنے مہنگے داموں آخر کتنا قرض چکاؤ گے
کل یہ سمندر خشک ہوا تو، طرزِ ندامت کیا ہوگی
کل یہ صحرا گرد ہوا تو کون سے رستے جاؤ گے

سیاہیوں میں اُمیدیں نہ راہ کھو بیٹھیں
طلوعِ صبح یقینی ہے فکرِ شام کرو

کچھ شعر پُرانی غزلوں کے

صبر و ضبط کے لیکر بے شمار نذرانے
تیری یاد آئی تھی آج دِل کو سمجھانے

تم نے بات کہہ ڈالی کوئی بھی نہ پہچانا
ہم نے بات سوچی تھی بن گئے ہیں افسانے

یہی مت سمجھنا تمھیں زندگی ہو
بہت دن اکیلے بھی ہم نے گزارے

ایسا دیکھا نہیں تنہائی کا سودا ہم نے !
شعر تک کتنے دنوں سے نہیں لکھّا ہم نے

شکستہ نظروں کی دُھند میں جب بچھڑ گیا وہ تو ہم نے دیکھا
نہ کوئی اندازِ رہ گذر تھا، نہ کوئی تصویرِ نقشِ پا تھی !

تمام لوگوں سے رکھ رکھاؤ تری ہی چاہت کا تھا سلیقہ
تمام دُنیا سے دوستی بھی تری محبت کا واسطہ تھی !

اس گرمیِ محفل میں کسی نے بھی نہ دیکھا
گزرے کسی جھونکے کی طرح ہم بھی ادھر سے
ہر صبح درخشاں تھا وہی حادثۂ دِل
ہر رات منوّر تھی اسی دیدۂ تَر سے

درد جب تلخیِ حالات میں ڈھل جاتا ہے
اک دیا دل کے لیے اور بھی جل جاتا ہے

ٹوٹ جاتے ہیں اندھیرے میں اُجالے کے لیے
شب کو تاروں کا بھی انداز بدل جاتا ہے

میں بے طلب نہیں ہر سانس کو سوال سمجھ
کہ مانگنا مجھے الفاظ سے نہیں آتا

آسودگئ دل پہ مسیحا سے گلہ ہے
اب درد بہت کم ہے تو آرام ہوا ہے

اے چارہ گرو! یہ رُخِ بیداد بھی دیکھو
ہم سے وہ ادا ساز نہ خوش ہے نہ خفا ہے

کڑے سفر میں مجھ کو چھوڑ دینے والا ہم سفر
بچھڑتے وقت اپنے ساتھ ساری دھوپ لے گیا

فنا ہو چکی ہیں زمانے کے ہاتھوں
تری جلوہ گاہیں، مری سجدہ گاہیں

دِلوں کے زخم چھپاؤ ہنسی کو عام کرو
یہ حکم ہے کہ بہاروں کا احترام کرو

مِعراج

خاموش تھا سارا جہاں
صحرا، سمندر، وادیاں

اِک جسمِ خاکی نے کیا
طے جادۂ ہفت آسماں

اِک پیکر آدم ہوا
عرشِ بریں کا میہماں

مخلوق و خالق میں ہوا
پیماں بہ طرزِ دوستاں

کمبل کا ٹکڑا بن گیا
ملبوسِ تقدیرِ جہاں

مٹی میں شامل ہو گئی
خُوش بُو تے نُورِ بیکراں

سحر کے پہلے اور بعد

مصنف : سعید الظفر چغتائی

صفحات :152

قیمت :-/64 روپے

انشائیات

مصنف : سید عابد حسین

صفحات : 240

قیمت : -/84 روپے

سائنس کی ترقی اور آج کا سماج

مصنف : سید ظہور قاسم

صفحات :48

قیمت :-/38 روپے

انتخاب مضامین سرسید
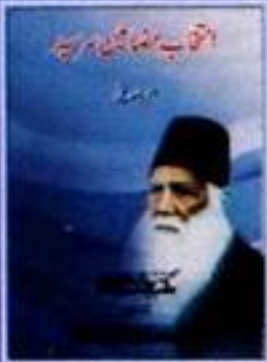
مصنف : انور صدیقی

صفحات : 140

قیمت : -/52 روپے

مجیب صاحب (احوال وافکار)
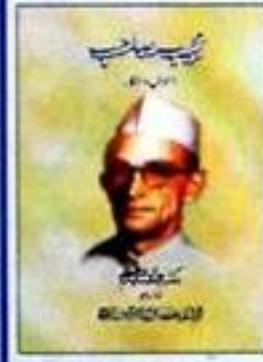
مرتبین : ضیاء الحسن فاروقی، مشیر الحق
شہاب الدین انصاری، عبداللطیف اعظمی

صفحات : 431

قیمت : -/90 روپے

لہو پکارتا ہے

مصنف : علی سردار جعفری

صفحات :166

قیمت :-/56 روپے

یادگارِ غالب

مصنف : الطاف حسین حالی

صفحات : 220

قیمت : -/66 روپے

تلاشِ آزاد

مصنف : عبدالقوی دسنوی

صفحات :140

قیمت :-/60 روپے

ISBN: 978-81-7587-814-3

9 788175 878143

₹ 85/-